رجسٹرڈ ایل نمبر 7360

جلد ۳ | اکتوبر ۱۹۶۰ء | عدد ۴

ماہنامہ

میثاق

لاہور

★

زیرِ ادارت

امین احسن اصلاحی

دفترِ رسالہ میثاق

رحمانپورہ اچھرہ - لاہور (پاکستان)

قیمت فی پرچہ : دس آنے | سالانہ : چھ روپے (بارہ شلنگ)

Monthly MEESAAQ Lahore

رجسٹرڈ ایل نمبر ۷۳۶۰

ماہنامہ میثاق لاہور

جلد ۳ | بابت ماہ اکتوبر ۱۹۶۰ء مطابق ربیع الثانی ۱۳۸۰ھ | عدد ۴

فہرست مضامین

تذکرہ و تبصرہ — امین احسن اصلاحی — ۲

تدبر قرآن

تفسیر سورہ بقرہ — " — ۹

مطالعہ حدیث

غربت اسلام کے اسباب — مولانا عبدالغفار حسن صاحب — ۲۳

مراسلہ و مذاکرہ

- شوریٰ سے متعلق دو اہم سوال
- ضبط ولادت کے حق میں قرآن سے استدلال

} امین احسن اصلاحی — ۳۸

اجتماعیات و سیاسیات

اسلام کا شورائی نظام — مولانا سید جلال الدین انصر عمری — ۴۳

مقالات

خانہ کعبہ کی اہمیت کے اسباب — مولانا ضیاء الدین صاحب اصلاحی — ۵۰

ہندوستانی خریداروں کے لیے ارسال زر کا پتہ :- مینیجر الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تذکرہ و تبصرہ

ماہ اگست ۱۹۶۰ء کے میثاق میں یاد ہوگا، اسلامی نظام سے متعلق ایک سائل کے جواب میں ہم نے لکھا تھا کہ اسلامی نظام کا قیام جس طرح پہلے ممکن ہوا ہے اسی طرح اس زمانہ میں بھی ممکن ہے لیکن یہ نظام صرف انبیاء علیہم السلام کے طریقہ پر کام کرنے سے قائم ہو سکتا ہے۔ اس زمانہ کی مشکل یہ ہے کہ سیاسی پارٹیوں کے غلط طریقے ذہنوں اور دماغوں پر اس قدر حاوی ہیں کہ اول تو لوگ انبیاء علیہم السلام کے طریقہ سے آشنا ہی نہیں ہیں اور اگر کوئی اس سے آشنا ہونے اور اس پر کام کرنے کا دعویٰ لے کر اٹھتا بھی ہے تو چند قدم بھی اس راہ پر چلنا نصیب نہیں ہوتا کہ گردوپیش اور یمین و یسار کے زوردار فتنے آدمی کو دھکیل کر اسی ڈگر پر ڈال دیتے ہیں جو اس زمانہ کی عام ڈگر ہے۔

ہماری اس تنقید سے بعض ذہنوں میں یہ سوال پیدا ہوا ہے کہ کیا انبیاء علیہم السلام نے اسلامی نظام کے قیام یا دوسرے الفاظ میں اقامت دین کے لیے کوئی خاص طریقہ بتایا ہے جو منصوص ہے اور جس کی پیروی اس مقصد کے لیے کام کرنے والوں پر ہر دور میں ضروری ہے؟ اگر ایسا ہے تو ہمیں بتانا چاہیے کہ وہ طریقہ کار کیا ہے تاکہ بات مجمل نہ رہے اور جو لوگ اس کو اختیار کرنا چاہیں، اختیار کر سکیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ سائل کے

جواب میں ہم نے مسئلہ کے اس پہلو کی وضاحت نہیں کی تھی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ موقع اس کی وضاحت کا نہیں تھا، لیکن مذکورہ بالا سوال کا ہماری طرف سے قطعی جواب یہی ہے کہ انبیاء علیہم السلام نے جس طرح طہارت و عبادات اور معاشرت و معیشت سے متعلق ہماری رہنمائی کے لیے اپنی سنتیں چھوڑی ہیں، اسی طرح اصلاح معاشرہ، اقامت دین یا اسلامی نظام کے طریقہ قیام سے متعلق بھی اپنی نہایت واضح سنتیں چھوڑی ہیں جن کو اختیار کیے بغیر اقامت دین کے نصب العین کے لیے کوئی نتیجہ خیز کام نہیں کیا جا سکتا۔ ان سے ہٹ کر جو کوشش بھی اس مقصد کے لیے کی جائے گی وہ بالکل بے برکت اور بے نتیجہ ثابت ہوگی۔ ہم نے خاص اسی عنوان پر "دعوت دین اور اس کا طریقہ کار" کے عنوان سے ایک کتاب لکھی ہے جن لوگوں کے ذہن میں اس امر خاص سے متعلق کوئی تشویش ہے، ہم ان کو مشورہ دیں گے کہ ہماری مذکورہ کتاب ایک مرتبہ صاف ذہن کے ساتھ وہ ضرور پڑھ ڈالیں۔

یہاں ہم اس موضوع پر تفصیل کے ساتھ لکھنے کے لیے گنجائش نہیں رکھتے۔ صرف چند اصولی باتوں کی طرف اشارہ کریں گے جس سے فی الجملہ یہ اندازہ ہو سکے گا کہ انبیاء علیہم السلام کا طریقہ کار کن خاص پہلوؤں سے اہل سیاست کے طریقوں سے مختلف ہوتا ہے۔

سب سے پہلی چیز جو انبیاء علیہم السلام اور ان کے طریقہ کار کو دوسروں سے اور ان کے طریقہ کار سے الگ کرتی ہے وہ یہ ہے کہ انبیاء جن باتوں کے داعی بن کر اٹھتے ہیں ان کے سب سے بڑے عملی مظہر وہ خود ہوتے ہیں۔ وہ جن نیکیوں کے مبلغ ہوتے ہیں اگر دوسروں سے ان پر پاؤ سیر عمل کا مطالبہ کرتے ہیں تو خود ان پر پورا سیر بھر عمل کرتے ہیں، اسی طرح جن برائیوں سے وہ لوگوں کو بچنے کی تلقین کرتے ہیں، ان کے بارے میں وہ دوسروں سے اگر وہ یہ چاہتے ہیں کہ لوگ ان سے احتراز کریں تو اپنے لیے ان کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ ان کی پرچھائیں بھی ان پر نہ پڑنے پائے۔ برعکس اس کے اہل سیاست کا عام طریقہ سیدنا مسیح علیہ السلام کے بقول یہ ہوتا ہے کہ جس بوجھ کے اٹھانے میں وہ اپنی انگلی کا بھی سہارا نہیں دینا چاہتے اس کو وہ پورا کا پورا دوسروں کی کمر پر لاد دیتے ہیں۔ قرآن مجید نے علمائے یہود کے بارے میں فرمایا ہے کہ تم دوسروں کو تو نیکی کا درس دیتے ہو لیکن خود اپنے آپ کو بھول جاتے ہو

اسی طرح اہل سیاست جن باتوں سے خود کوسوں دور ہوتے ہیں ان کی منادی وہ اپنی ہر تحریر و ہر تقریر میں کرتے پھرتے ہیں۔ وہ اپنے قول ہی کو عمل کا قائم مقام سمجھتے ہیں اور محض زبان کے جھاگ سے وہ ثمرات و نتائج حاصل کرنا چاہتے ہیں جو نتائج خون اور پسینہ ایک کر دینے سے حاصل ہوتے ہیں اور جن کے لیے آدمی کو اپنے ایک ایک بُن مو کو گواہ بنانا پڑتا ہے۔ آپ اگر ایمان داری سے اپنے حالات کا جائزہ لیں گے تو ہماری اس رائے سے اتفاق کریں گے کہ ہماری قوم کو ایک مدت دراز سے ایسے ہی طبیبوں سے سابقہ ہے جو سو مرضوں کے مریض ہونے کے باوجود قوم کے علاج کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور جو اپنی آنکھوں میں بڑے بڑے شہتیر چھپائے رکھنے کے باوجود دوسروں کی آنکھوں کے تنکے تلاش کرنے میں ید طولیٰ رکھتے ہیں —— ایسے طبیبوں کی اس علاج کا جو نتیجہ برآمد ہو سکتا ہے وہ معلوم ہے۔

دوسری چیز جو حضرات انبیاءؑ کے طریقہ کو دوسروں کے طریقہ سے ممتاز کرتی ہے وہ یہ ہے کہ انبیاء سیاسی اقتدار کے حصول پر اصلاح معاشرہ کے کام کو منحصر نہیں قرار دیتے بلکہ معاشرہ کی اصلاح کو نظام سیاسی کی اصلاح کا ذریعہ بناتے ہیں۔ ان کے طریقہ کار میں اصل اہمیت جس چیز کو حاصل ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ لوگوں کے دل و دماغ اور اعمال و اخلاق تبدیل ہوں اور برائی سے لڑنے اور بھلائی کو قائم کرنے کے لیے ان کے ضمیر پوری طرح بیدار ہو جائیں۔ یہ بیداری پیدا کرنے کے لیے وہ جدوجہد کرتے ہیں اور یہ جدوجہد وہ مسلسل جاری رکھتے ہیں یہاں تک کہ دو باتوں میں سے کوئی ایک بات ظاہر ہو کر رہتی ہے یا تو اللہ تعالیٰ نے ان کی کوششوں سے ایک صالح معاشرہ کھڑا کر دیا ہے اور اس معاشرہ کے ہاتھوں ایک صالح نظام قائم ہو گیا ہے یا اسی مقدس کام میں ان کی زندگیاں ختم ہو گئی ہیں اور چند نفوس کے سوا کسی نے بھی ان کا ساتھ نہیں دیا ہے۔ حضرات انبیاء کی زندگیوں میں ان دونوں ہی چیزوں کی مثالیں ملتی ہیں اور اس دوسری چیز کی مثالیں کم نہیں بلکہ پہلی چیز کے مقابل میں کچھ زیادہ ہی ملتی ہیں لیکن کسی ایک نبی کی زندگی میں بھی اس بات کی کوئی مثال نہیں ملتی کہ اس نے معاشرہ کی اصلاح کو نظام کی اصلاح کا ذریعہ بنانے کے بجائے اس مقصد کے لیے دعوت شروع کر دی ہو کہ پہلے جس طرح بنے اقتدار پر قبضہ کرو اور پھر اس اقتدار کو اصلاح معاشرہ کا ذریعہ بناؤ۔

اس کے بالکل برعکس سیاسی طور پر کام کرنے والوں کی ساری بھاگ دوڑ حصول اقتدار کے لیے ہوتی ہے۔ بعض اس اقتدار کے حصول کے لیے آئینی طریقے اختیار کرتے ہیں، بعض غیر آئینی راستے بھی اختیار کرنے میں کوئی قباحت نہیں محسوس کرتے۔ جو لوگ آئینی طریقے اختیار کرتے ہیں ان کا سارا اعتماد اس بات پر ہوتا ہے کہ ووٹروں کی زیادہ سے زیادہ تعداد ان کے ساتھ ہو۔ اس وجہ سے ان کی توجہات ان ووٹروں کے ساتھ جوڑ توڑ پر صرف ہوتی ہے۔ ان کو ساتھ ملانے کے لیے وہ سارے جتن کر ڈالتے ہیں یہاں تک کہ اس سرگرمی میں وہ جائز اور ناجائز کی بھی کچھ زیادہ پروا نہیں کرتے۔ کوئی بات اگر انھیں ناجائز محسوس ہوتی بھی ہے تو وہ یہ خیال کر کے اپنے اس ناجائز کو جائز بنا لیتے ہیں کہ کسی بڑے مقصد کے لیے کسی چھوٹے ناجائز کو جائز کر لینے میں کوئی خرابی نہیں ہے۔ ووٹروں سے ان کا سارا یارانہ ووٹ حاصل کرنے کے لیے ہوتا ہے، اس سے زیادہ ان کے خیر و شر سے انھیں کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ اگر وہ اپنے ووٹ انھیں دے دیں تو ان کے نقطہ نظر سے وہ معاشرہ کے بہترین افراد ہیں اگرچہ وہ فی الواقع اتنے برے ہوں کہ ان کے فتنوں سے شیطان بھی پناہ مانگتا ہو۔ اس طرز کے لوگ اگر معاشرہ کی خدمت اور اصلاح کا کوئی چھوٹا یا بڑا کام کرتے بھی ہیں تو اس میں بھی خلوص اور للہیت کا حصہ بہت کم ہوتا ہے۔ اصل پیش نظر مقصد وہی ہوتا ہے جس کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے یعنی یہ کہ ان کی ان خدمتوں سے متاثر ہو کر انتخابات میں لوگ اپنے ووٹ ان کے حق میں استعمال کریں۔ یہ مقصد اس گروہ پر اتنا غالب ہوتا ہے کہ اگر یہ کہا جائے کہ یہ حضرات اپنے انتخابی حلقوں میں نماز بھی اگر پڑھتے ہیں تو اسی ووٹ کے مقصد سے پڑھتے ہیں تو شاید اس میں بھی کوئی مبالغہ نہ ہو۔ پھر خاص بات یہ ہے کہ ان سیاسی کارفرماؤں کا سارا جوش کار صرف اسی وقت تک باقی رہتا ہے جب تک ان کے لیے برطانوی طرز کا پارلیمانی نظام ملک میں قائم ہے۔ اگر یہ نظام قائم نہ ہو تو ان کا سارا جوش جہاد و اصلاح اسی طرح ٹھنڈا پڑ جاتا ہے گویا تو مُردوں کے یہ ایک مُردہ ہیں۔ یہ ساری خرابی درحقیقت ان کے طریقہ کار کی ہے ورنہ انبیاءؑ علیہم السلام اس بات کے محتاج کب رہے ہیں کہ ملک میں امریکی یا انگریزی طرز کا نظام ہو تب وہ کام کریں ورنہ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جائیں۔

یہ ذکر آئینی طریقہ پر کام کرنے والوں کا تھا۔ جو لوگ غیر آئینی طریقہ پر کام کرتے ہیں ان کا اعتماد خفیہ سازشوں

پر ہوتا ہے۔ وہ اپنے نظریات کھلے میدان میں عقل اور استدلال کی راہ سے منوانے پر اعتماد نہیں رکھتے اسی وجہ سے سازشی طریقے اختیار کرتے ہیں۔ اس راہ سے اقتدار حاصل کرنے میں اگر ان کو کامیابی ہو جاتی ہے تو پھر سیاسی جبر کے ذریعے سے وہ معاشرہ پر اپنے نظریات مسلط کر دیتے ہیں۔ اشتراکیت کے علمبرداروں کا طریقہ کار یہی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ طریقہ کار انبیاء کے طریقہ کار سے پہلے طریقے سے بھی زیادہ دور ہے، اس لیے کہ اس کی بنیاد جبر پر ہے اور انبیاء کے طریقہ میں جبر کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ خواہ یہ جبر آئین کے ذریعہ سے حاصل کردہ اقتدار کے ہاتھوں استعمال ہو یا سازش کے ذریعے سے حاصل کردہ اقتدار کے ذریعے سے۔ ہاتھوں کے اختلاف سے اصل حقیقت میں کوئی فرق نہیں واقع ہوتا۔ اسلامی نظام کوئی مجبوری کا سودا نہیں ہے بلکہ آزادانہ ایمان و اسلام کا معاملہ ہے اور اس کے لیے واحد پسندیدہ طریقہ یہی ہے کہ یہ ایک آزاد اسلامی معاشرہ میں اس کی آزادانہ مرضی اور آزادانہ رائے سے قائم ہو، وہ لوگ اس کو قائم کریں جنھوں نے عقل سے اس کو قبول کیا ہو، دل سے اس کو مانا ہو اور عمل سے اس کی گواہی دے رہے ہوں۔

بعض لوگوں کو یہ شبہ ہوتا ہے کہ اگر اسلامی نظام کا قیام معاشرہ کی اصلاح ہی پر منحصر ہے اور اس کے لیے اہل سیاست کے سے طریقے نہیں اختیار کیے جا سکتے تو پھر یہ بیل کبھی منڈھے نہیں چڑھ سکتی۔ ان کے خیال میں یہ طریقہ کار اتنی طویل مدت چاہتا ہے کہ جب تک معاشرہ کی اصلاح ہوگی اس وقت تک جو خرابیاں آج پاؤ سیر ہیں موجودہ نظام کے زیر سایہ پرورش پا کر من بھر ہو جائیں گی۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ آج اگر اسلام کا نام لینے کا موقع ہے تو کل یہ نام لینے کا بھی امکان نہیں باقی رہے گا۔ یہ بات بہت سے لوگوں کو دھوکے میں ڈالے ہوئے ہے لیکن ہمارے خیال میں اس میں کئی مغالطے چھپے ہوئے ہیں۔

اس میں پہلا مغالطہ تو یہ ہے کہ یہ حضرات اس بات کو محسوس نہیں کرتے کہ اگر ایک صحیح کام صحیح طریقہ پر کرنے میں بہت دیر لگنے کا اندیشہ ہے تو اس کی تلافی کا یہ کونسا دانشمندانہ طریقہ ہے کہ ایک غلط کام بالکل غلط طریقہ ہی پر کر ڈالا جائے۔ غلط کام بہر حال غلط ہے، وہ اس وجہ سے صحیح نہیں بن جائے گا کہ وہ جلدی سے انجام پا جاتا ہے۔ ہر کام

کی ایک مخصوص فطرت ہوتی ہے اور وہ نتیجہ خیز اسی صورت میں ہوتا ہے جب اس کو اس کے مخصوص ڈھب پر انجام دیا جائے۔ اگرچہ اس میں کتنا ہی وقت لگے۔

دوسرا مغالطہ یہ ہے کہ بعض لوگ زبان کے جہاد اور عمل کے جہاد میں، اثرات و نتائج کے لحاظ سے جو فرق ہے اس کو نہیں سمجھتے۔ اگر اسلامی نظام کا دعویٰ محض زبان اور قلم پر ہو، عملی زندگی اسلام کے حقیقی رنگ میں رنگی ہوئی نہ ہو تو اسلامی نظام تا قیامت قائم نہیں ہو سکتا۔ اگرچہ آپ کو سیاسی اقتدار حاصل ہی کیوں نہ ہو جائے۔ سیاسی اقتدار دنیا میں اسلام کے بہت سے مدعیوں کو حاصل ہوا لیکن اسلام کے لیے وہ اگر کچھ مفید ہوا تو اسی شکل میں ہوا جب اقتدار والوں کی عملی زندگیوں میں اسلام کا کچھ اثر رہا۔ برخلاف اس کے ہم نے اپنی آنکھوں سے ایسے اشخاص دیکھے ہیں جنھوں نے چند سالوں کے اندر اندر معاشرہ کے معاشرہ کو اپنے رنگ میں رنگ ڈالا اور ملکوں اور قوموں کی قسمتیں بدل دیں حالانکہ جب انھوں نے یہ کام کیے ان کو سیاسی اقتدار حاصل نہیں تھا۔ اگر ان کو کوئی چیز حاصل تھی تو صرف یہ تھی کہ وہ اپنے اصولوں، اپنے نظریات اور اپنے دعاوی کے فی الواقع عملی مظہر تھے اگرچہ ہمارے نزدیک ان کے بہت سے نظریات صحیح نہیں تھے لیکن کردار کا جادو وہ چیز ہے کہ بسا اوقات یہ کنجشک فرومایہ کو بھی عقاب و شاہین کی سرعت بخش دیتا ہے۔

تیسرا مغالطہ یہ ہے کہ لوگ سمجھتے ہیں کہ اگر اقتدار پر قبضہ کر کے برائی کے پھیلانے والے طاقتور ہاتھوں کو معطل نہ کر دیا جائے تو بھلائی کے پھیلانے کا کوئی امکان ہی باقی نہیں رہ جاتا۔ ہمارے نزدیک یہ بات بھی صحیح نہیں ہے۔ کسی معاشرہ میں برائی کے پھیلنے کی اصل وجہ یہ نہیں ہوتی ہے کہ برائی پھیلانے والے ہاتھ بڑے زوردار اور موثر ہیں بلکہ اس کی اصلی وجہ یہ ہوا کرتی ہے کہ ان برائیوں کی برائی سے لوگوں کو آگاہ کرنے والے یا تو موجود ہی نہیں ہوتے، یا موجود تو ہوتے ہیں لیکن ان میں اخلاص، دلسوزی، دردمندی اور عزیمت نہیں ہوتی۔ اگر کسی معاشرہ کے اندر معاشرہ کا سچا درد رکھنے والے، برائیوں پر تڑپ جانے والے، علم و دلیل کے ساتھ بات کرنے والے اور ہر برائی کے مقابل میں صداقت و عزیمت کے ساتھ ڈٹ جانے والے موجود ہوں تو وہ کسی سیاسی طاقت کے بغیر برائی کے طاقتور سے طاقتور ہاتھوں کو بھی معطل کر کے رکھ دیتے ہیں۔ ایسے مردان حق کے سامنے برائی خواہ کتنے ہی زور اور دبدبہ کے ساتھ آئے لیکن وہ بھلائی کو مغلوب کرنے کے بجائے خود اپنے آپ کے حرمان

کرتی ہے اور بالآخر اسے میدان سے پسپا ہونا پڑتا ہے۔ اس کے خلاف اگر کوئی شہادت نہیں ملتی ہے تو صرف ایسے معاشرہ کے اندر ملتی ہے جس کا فساد اس قدر بڑھ چکا ہو کہ قدرت کی طرف سے اس کے لیے ہلاکت مقدر ہو چکی ہو۔ ورنہ معاشرہ کے اندر اگر زندگی کی کوئی رمق باقی ہے تو صحیح طور پر کام کرنے والوں نے ان مظالم کو بھی حق کے لیے غذا بنا دیا ہے جو طاقتور ہاتھوں نے باطل کی حمایت میں کیے ہیں۔ تنور میں آگ زوردار ہو تو گیلی لکڑی بھی اس کو بجھانے کے بجائے اس کے لیے ایندھن کا کام دے جاتی ہے۔

انبیاء علیہم السلام کے طریقہ کار کی تیسری خصوصیت یہ ہے کہ ان کی مخالفت و موافقت جو کچھ بھی ہوتی ہے وہ لِلّٰہ و فی اللّٰہ ہوتی ہے۔ وہ حق کے ساتھی ہیں خواہ وہ اُن کے دشمن ہی کے اندر پایا جائے اور باطل کے وہ مخالف ہوتے ہیں اگرچہ وہ ان کے کسی ہوا خواہ کے اندر ہی کیوں نہ پایا جائے۔ انھیں کسی خاندان، کسی گروہ، کسی پارٹی اور کسی قوم سے محض اس کے ایک مخصوص گروہ یا خاندان یا پارٹی ہونے کے سبب سے نہ دشمنی ہوتی اور نہ دوستی۔ دشمنی اور دوستی جو کچھ انھیں ہوتی ہے اصول و عقائد اور اعمال و اخلاق کی بنا پر ہوتی ہے۔ وہ اپنے مخالف کی خوبیوں کا بھی اسی فیاضی کے ساتھ اعتراف کرتے ہیں جس فیاضی کے ساتھ اپنے موافق کی خوبیوں کا اعتراف کرتے ہیں اور اسی طرح اپنے موافق کی برائیوں پر بھی اسی شدت کے ساتھ نکیر کرتے ہیں جس شدت کے ساتھ اپنے کسی مخالف کی برائیوں پر نکیر کرتے ہیں۔

برعکس اس کے جو لوگ سیاسی طریقوں پر کام کرتے ہیں ان کی دوستی اور دشمنی ان کے گروہی مفاد اور سیاسی مصالح و اغراض پر مبنی ہوتی ہے۔ ان کی تمام جدوجہد کا محور صرف اقتدار رہتا ہے اس وجہ سے ان کی یہ فطرت بن جاتی ہے کہ جو اقتدار سے محروم ہوں وہ اصحاب اقتدار کے اندر کسی خوبی کا اقرار نہ کریں اگرچہ وہ خوبی سورج کی طرح روشن ہو۔ اور جو اقتدار کی کرسی پر براجمان ہوں وہ اقتدار سے محروم جماعتوں کی کسی خوبی کا اعتراف نہ کریں اگرچہ وہ خوبی اندھوں کو بھی نظر آتی ہو۔ جس طرح ہم نے آج تک کسی ہڈی کی موجودگی میں دو کتوں کو ایک دوسرے کے لیے انصاف پسند اور خیرخواہ نہیں پایا اسی طرح اقتدار کی استخوان نزاع کی موجودگی میں اقتدار کے حاملین اور اقتدار سے محرومین کو بھی ایک دوسرے کے لیے خیرخواہ اور انصاف پسند نہیں پایا۔ اختلاف برائے اختلاف ان کا دین ہوتا ہے اور اپنے اس دین کی پیروی وہ بحالت ہوش و حواس اور بہ ثبات عقل و اختیار کرتے ہیں اور اس احمقانہ رویہ کو اپنی سیاسی زندگی کی ایک ایسی ناگزیر ضرورت مانتے ہیں جس سے ان کے نزدیک مفر کی کوئی صورت ہی باقی نہیں رہ جاتی ہے۔ (باقی)

تدبر قرآن

امین احسن اصلاحی

تفسیر سورہ بقرہ

(۱۵)

۳۴۔ آگے کا سلسلہ کلام آیہ ۶۲ تک

آگے یہود کو از سرِ نو مخاطب کرکے پہلے تو ایک مختصر تمہید میں ان کو اس بات کی یاددہانی کی گئی ہے کہ فضیلت و بزرگی تمہیں جو کچھ بھی حاصل ہوئی ہے محض اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے حاصل ہوئی ہے۔ اس میں نہ تو تمہارے استحقاق کو کوئی دخل ہے، نہ تمہارے خاندانی شرف کو۔ اس وجہ سے اس قسم کے کسی وہم یا گھمنڈ میں مبتلا ہو کر اس دعوت حق سے منہ نہ موڑو جو تمہارے سامنے پیش کی گئی ہے۔ ورنہ یاد رکھو کہ ایک دن آنے والا ہے جس میں تمہیں اپنے اعمال کی خود ہی جواب دہی کرنی ہے، تمہارے فرائض سے متعلق نہ تو دوسروں سے سوال ہوگا اور نہ دوسرے تمہاری طرف سے کوئی جواب دہی کریں گے۔

اس کے بعد بنی اسرائیل کی ابتدائی تاریخ کے چند اہم واقعات کے حوالے دے کر ان کے سامنے تین حقیقتیں واضح فرمائی ہیں۔

ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ نے تم پر جتنے بھی انعامات کیے ہیں سب تمہاری ناشکریوں کے باوجود محض اپنے فضل و کرم سے کیے ہیں۔ تمہاری پوری تاریخ شاہد ہے کہ تم نے اپنی ناسپاسی اور ناشکری کے سبب سے ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی ناقدری کی ہے لیکن اس نے تمہارے اس کفران نعمت کے باوجود تم کو اپنے احسانات سے نوازا ہے۔ اس وجہ سے تمہیں اپنے تقدس و تقرب کا بہت زیادہ غرور نہیں ہونا چاہیے۔

دوسری یہ کہ تم کو جو نعمت بھی خدا نے بخشی ذمہ داریوں اور فرائض کے ساتھ بخشی، خاندانی ورثہ کے طور پر نہیں بخشی۔ چنانچہ تمہاری تاریخ گواہ ہے کہ جب جب تم نے کسی نعمت کا حق ادا کرنے اور اس سے پیدا ہونے والی ذمہ داریاں پوری کرنے میں کوتاہی کی ہے تم پر مار بھی بڑی ہی سخت پڑی ہے۔

تیسری یہ کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں کسی کو بھی کوئی شرف یا تقرب اس کے ذاتی یا خاندانی استحقاق یا کسی گروہ کے ساتھ نسبت رکھنے کی بنا پر حاصل نہیں ہوتا بلکہ صرف الایمان باللہ الایمان بالآخرۃ اور عمل صالح کی بنا پر حاصل ہوتا ہے۔

یہ سارا مضمون آیت ۴۷ سے شروع ہو کر آیت ۶۲ پر ختم ہوتا ہے اور مقصود اس ساری تفصیل سے بنی اسرائیل کی ان بیماریوں کو دور کرنا ہے جن کے سبب سے قرآن کی دعوت ان کے لیے ایک بہت بڑی آزمائش بن گئی تھی۔

اس تمہید کو ذہن میں رکھ کر اب آگے کی آیات کی تلاوت فرمائیے۔ فرمایا:-

يٰبَنِىْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِىْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَنِّىْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى
الْعٰلَمِيْنَ ۝٤٧ وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِىْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْـًٔا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا
شَفَاعَةٌ وَّلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ۝٤٨ وَاِذْ نَجَّيْنٰكُمْ
مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ يُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ وَيَسْتَحْيُوْنَ
نِسَآءَكُمْ ۭ وَفِىْ ذٰلِكُمْ بَلَاۗءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ ۝٤٩ وَاِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ
فَاَنْجَيْنٰكُمْ وَاَغْرَقْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ۝٥٠ وَاِذْ وٰعَدْنَا مُوْسٰٓى
اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ۝٥١ ثُمَّ
عَفَوْنَا عَنْكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝٥٢ وَاِذْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ
وَالْفُرْقَانَ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ۝٥٣ وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ
اَنْفُسَكُمْ بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجْلَ فَتُوْبُوْٓا اِلٰى بَارِىِٕكُمْ فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ۭ ذٰلِكُمْ
خَيْرٌ لَّكُمْ عِنْدَ بَارِىِٕكُمْ ۭ فَتَابَ عَلَيْكُمْ ۭ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ۝٥٤ وَاِذْ

قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً فَاَخَذَتْكُمُ الصّٰعِقَةُ
وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ۝٥٥ ثُمَّ بَعَثْنٰكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَوْتِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝٥٦
وَظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ وَاَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى ۭ كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ
مَا رَزَقْنٰكُمْ ۭ وَمَا ظَلَمُوْنَا وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ۝٥٧ وَاِذْ قُلْنَا ادْخُلُوْا
هٰذِهِ الْقَرْيَةَ فَكُلُوْا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ رَغَدًا وَّادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَّ
قُوْلُوْا حِطَّةٌ نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطٰيٰكُمْ ۭ وَسَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ ۝٥٨ فَبَدَّلَ
الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا قَوْلًا غَيْرَ الَّذِىْ قِيْلَ لَهُمْ فَاَنْزَلْنَا عَلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا رِجْزًا
مِّنَ السَّمَاۗءِ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ۝٥٩ وَاِذِ اسْتَسْقٰى مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ فَقُلْنَا
اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ ۭ فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا ۭ قَدْ عَلِمَ
كُلُّ اُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ ۭ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا مِنْ رِّزْقِ اللّٰهِ وَلَا تَعْثَوْا فِى الْاَرْضِ
مُفْسِدِيْنَ ۝٦٠ وَاِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰى طَعَامٍ وَّاحِدٍ فَادْعُ لَنَا
رَبَّكَ يُخْرِجْ لَنَا مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ مِنْۢ بَقْلِهَا وَقِثَّاۗىِٕهَا وَفُوْمِهَا وَعَدَسِهَا
وَبَصَلِهَا ۭ قَالَ اَتَسْتَبْدِلُوْنَ الَّذِىْ هُوَ اَدْنٰى بِالَّذِىْ هُوَ خَيْرٌ ۭ اِهْبِطُوْا
مِصْرًا فَاِنَّ لَكُمْ مَّا سَاَلْتُمْ ۭ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ ۤ وَ
بَاۗءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَ
يَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ الْحَقِّ ۭ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ۝٦١ اِنَّ
الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالنَّصٰرٰى وَالصّٰبِـِٕيْنَ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ
الْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ښ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ
وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝٦٢

اے بنی اسرائیل میری اس نعمت کو یاد کرو جو میں نے تم پر کی اور اس بات کو کہ میں نے تمہیں دنیا والوں پر

فضیلت دی اور اس دن سے ڈرو جس دن کوئی جان کسی دوسری جان کے کچھ کام نہ آئے گی، نہ اس کی طرف سے کوئی سفارش قبول ہوگی، نہ اس سے کوئی معاوضہ لیا جائے گا اور نہ ان کی کوئی مدد کی جائے گی۔

اور یاد کرو جب کہ ہم نے تم کو آلِ فرعون کے قبضہ سے چھڑایا۔ وہ تمہیں برے عذاب چکھاتے تھے۔ تمہارے بیٹوں کو ذبح کرتے اور تمہاری عورتوں کو زندہ رکھتے تھے اور اس میں تمہارے رب کی طرف سے بڑی آزمائش تھی۔

اور یاد کرو جب کہ ہم نے دریا کو پھاڑ کر تمہیں پار کرایا، پس تمہیں نجات دی اور آلِ فرعون کو غرق کر دیا اور تم دیکھتے رہے۔

اور یاد کرو جب کہ ہم نے موسیٰ سے چالیس راتوں کا وعدہ ٹھہرایا۔ پھر تم نے اس کے بعد بچھڑے کو معبود بنا لیا اور تم ظلم کرنے والے ہو۔ پھر ہم نے تم سے درگزر کیا اس کے بعد تاکہ تم شکر گزار بنو۔

اور یاد کرو جب کہ ہم نے موسیٰ کو کتاب دی اور فرقان تاکہ تم ہدایت حاصل کرو۔

اور یاد کرو جب کہ موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا کہ اے میری قوم کے لوگو تم نے بچھڑے کو معبود بنا کر اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے تو اپنے پیدا کرنے والے کی طرف رجوع کرو اور اپنے مجرموں کو اپنے ہاتھوں قتل کرو، یہ تمہارے لیے تمہارے پیدا کرنے والے کے نزدیک بہتر ہے تو اس نے تمہاری توبہ قبول فرمائی، بے شک وہی توبہ قبول کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔

اور یاد کرو جب کہ تم نے کہا کہ اے موسیٰ ہم تمہارا یقین کرنے والے نہیں ہیں جب تک کہ ہم خدا کو کھلم کھلا دیکھ نہ لیں تو تم کو کڑک نے آ دبوچا اور تم دیکھتے رہ گئے۔ پھر ہم نے تمہاری موت کے بعد تمہیں اٹھایا تاکہ تم شکر گزار بنو اور تم پر بدلیوں کا سایہ کیا اور تم پر من و سلویٰ اتارے، کھاؤ ان پاکیزہ چیزوں میں سے جو ہم نے تم کو بخشی ہیں۔ اور انھوں نے ہمارا کچھ نہیں بگاڑا بلکہ وہ اپنی ہی جانوں پر ظلم کرتے رہے۔

اور یاد کرو جب کہ ہم نے کہا "داخل ہو جاؤ اس بستی میں، پس کھاؤ اس میں سے جہاں سے چاہو فراغت کے ساتھ اور داخل ہو دروازے میں سر جھکائے ہوئے اور دعا کرو کہ اے رب ہمارے گناہ بخش دے

ہم تمہارے گناہ بخش دیں گے اور اچھی طرح حکم بجا لانے والوں پر ہم مزید فضل کریں گے۔ تو جنھوں نے ظلم کیا انھوں نے بدل دیا اس بات کو جو ان سے کہی گئی تھی دوسری بات سے۔ پس ہم نے ان لوگوں پر جنھوں نے ظلم کیا ان کی نافرمانی کے سبب سے آسمان سے عذاب اتارا۔

اور یاد کرو جب کہ موسیٰ نے اپنی قوم کے لیے پانی کی دعا کی تو ہم نے کہا اپنی لٹھیا پتھر پر مارو تو اس سے بارہ چشمے پھوٹ نکلے۔ ہر گروہ نے اپنا اپنا گھاٹ متعین کر لیا۔ کھاؤ اور پیو اللہ کے رزق میں سے اور نہ پھرو زمین میں فساد مچانے والے بن کر۔

اور یاد کرو جب کہ تم نے کہا اے موسیٰ ہم ایک ہی قسم کے کھانے پر ہرگز صبر نہیں کر سکتے تو اپنے رب سے ہمارے لیے دعا کرو کہ وہ ہمارے لیے ان چیزوں میں سے نکالے جو زمین اگاتی ہے اپنی سبزیوں، ککڑیوں، لہسن، مسور اور پیاز میں سے۔ کہا کیا تم اعلیٰ کو ادنیٰ سے بدلنا چاہتے ہو؟ کسی شہر میں اترو تو وہ چیز تمہیں ملے گی جو تم نے طلب کی ہے اور ان پر ذلت اور پست ہمتی تھوپ دی گئی اور وہ خدا کا غضب لے کر لوٹے۔ یہ اس سبب سے کہ وہ اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے تھے اور نبیوں کو ناحق قتل کرتے تھے۔ یہ اس وجہ سے کہ انھوں نے نافرمانی کی اور وہ حد سے بڑھ جانے والے تھے۔

بے شک جو ایمان لائے، جو یہودی ہوئے اور نصاریٰ اور صابی ان میں سے جو اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان لایا اور جس نے عمل صالح کیا تو اس کے لیے اس کے رب کے پاس اجر ہے اور ان کے لیے کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

---

۳۵ - الفاظ کی تحقیق اور جملوں کی وضاحت

اذکروا نعمتی التی انعمت علیکم وانی فضلتکم علی العالمین

لفظ نعمت کی وضاحت اوپر ہو چکی ہے۔ یہاں اسی پر وانی فضلتکم علی العلمین کو عطف کیا ہے یہ عام کے بعد خاص کا ذکر اس اجمال کی وضاحت کر رہا ہے جو نعمت کے لفظ کے اندر موجود ہے۔ اس

فضیلت سے مراد قوموں کی ہدایت و رہنمائی کا وہ منصب ہے جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو ایک خاص دور میں منتخب فرمایا۔ جو فضیلت کسی منصب کی ذمہ داریوں کے ساتھ وابستہ ہوتی ہے، وہ ایک مشروط فضیلت ہوتی ہے۔ اگر صاحبِ منصب قوم اس ذمہ داری کو ادا کرتی ہے تو یہ فضیلت اس کو حاصل رہتی ہے اور اگر اس کو چھوڑ بیٹھتی ہے تو صرف اسی فضیلت ہی سے محروم نہیں ہو جاتی جو اسے بخشی گئی تھی، بلکہ کفرانِ نعمت کی پاداش میں اس کو مزید براں ذلت بھی نصیب ہوتی ہے۔ یہاں بنی اسرائیل کو یہ بات یاد دلائی گئی ہے کہ جس فضیلت پر تمہیں ناز ہے وہ فضیلت خدا ہی کی عطا کردہ تھی، اگر اس کو باقی رکھنا چاہتے ہو تو خدا کے عہد پر قائم رہو اور اس کا حق ادا کرو۔ خدا کے عہد سے نکل کر تم اس فضیلت کو قائم نہیں رکھ سکتے۔

قوموں کی ہدایت و رہنمائی کے لیے بنی اسرائیل کے منتخب کیے جانے کا ذکر قرآن مجید میں دوسری جگہ بھی ہے۔ مثلاً فرمایا ہے:۔ ولقد اخترنٰھم علیٰ علمٍ علی العٰلمین ۳۲ - دخان (اور ہم نے ان کو دنیا والوں کی رہنمائی کے لیے منتخب کیا، دیکھ بھال کر) یہاں علیٰ علم کے الفاظ سے یہ اشارہ نکلتا ہے کہ یہ انتخاب کسی اندھے کا انتخاب نہیں تھا کہ جس پر ہاتھ پڑ گیا اس کو اس نے منتخب کر دیا، بلکہ یہ کام ایک صاحبِ علم و بصیرت نے کیا ہے جو اپنے علم و بصیرت سے یہ معلوم کر سکتا ہے کہ کب یہ اس منصب کے اہل ہیں اور کب نہیں ہیں۔

واتقوا یوماً ..... ولا ھم ینصرون | جزی عنہ کے معنی ہیں، اس کی طرف سے ادا کر دیا، یا اس کی طرف سے کافی ہو گیا۔ لا تجزی نفس عن نفس شیئاً کے معنی ہوں گے کہ کوئی شخص کسی دوسرے کے کچھ کام نہ آ سکے گا۔ جو ذمہ داری اس پر عائد ہوتی ہوگی، کوئی دوسرا اس کی طرف سے وہ ادا نہ کر سکے گا۔ یہ مضمون قرآن مجید میں مختلف اسلوبوں سے بیان ہوا ہے۔ مثلاً ولا تزر وازرۃ وزر اخریٰ[1] (اور کوئی جان کسی دوسرے کا بوجھ نہ اٹھا سکے گی) واخشوا یوماً لا یجزی والد عن ولدہ ولا مولود ھو جاز عن والدہ شیئاً[2] (اور اس دن سے ڈرو جس دن کوئی باپ اپنی اولاد کے کام نہ آ سکے گا اور نہ کوئی بیٹا ہی اپنے باپ کے کچھ کام آ سکے گا) اس دن ہر ایک پر نفسی نفسی کی حالت طاری ہوگی۔ لکل امرئٍ منھم یومئذٍ شان یغنیہ (۳۷ - عبس)

۱؎ ۱۶۴ - انعام۔ ۲؎ لقمان

شفاعت، شفع سے ہے۔ شَفَعَ الشیءَ کے معنی ہیں، اس کے ساتھ اسی طرح کی چیز کو ملا کر اس کو جوڑا کر دیا۔ شفع لفلان یا تشفع فیہ کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کسی کی بات یا درخواست کے ساتھ کوئی شخص اپنی تائید یا سفارش ملا کر اس کو مؤید کر دے۔

عدل کے معنی انصاف کے ہیں۔ فرمایا ان تحکموا بالعدل[1] (یہ کہ انصاف کے ساتھ فیصلہ کرو) پھر یہیں سے یہ لفظ مساوی اور برابر کے معنی میں استعمال ہوا۔ فرمایا او عدل ذٰلک صیاماً[2] (یا اس کے برابر روزے) نیز فدیہ کے معنی میں استعمال ہوا کیونکہ فدیہ جس کا فدیہ ہوتا ہے اسی کے برابر سمجھا جاتا ہے۔

لا یقبل منھا شفاعۃ ولا یوخذ منھا عدل ولا ھم ینصرون میں عربی زبان کا وہ اسلوب ملحوظ ہے جس میں بظاہر تو ایک شے کے لازم کی نفی ہوتی ہے لیکن مقصود درحقیقت ملزوم کی نفی ہوتی ہے۔ امراء القیس نے اپنے ایک شعر میں ایک صحرائی راستہ کی تعریف کی ہے کہ لا یھتدی بمنارہ (اس کی برجیوں سے رستہ معلوم نہیں کیا جاتا) ظاہر ہے کہ اس طرزِ تعبیر سے اس کا مقصود یہ بتانا ہے کہ اس صحرا میں رہنمائی کے لیے برجیاں اور منارے سرے سے موجود ہی نہیں ہیں۔ اسی اسلوب پر یہاں یہ بتانا مقصود ہے کہ اس دن نہ کوئی ان کے لیے شفاعت کرنے والا ہوگا، نہ کوئی شفاعت قبول ہوگی، نہ کسی کے پاس دینے کے لیے معاوضہ ہوگا، نہ کسی سے معاوضہ لیا جائے گا، نہ کسی کے حامی اور مددگار ہوں گے۔ نہ کسی کی حمایت و مدد کی جا سکے گی۔ یہی حقیقت دوسرے الفاظ میں اس طرح بیان ہوئی ہے۔ فما تنفعھم شفاعۃ الشافعین[3] (پس ان کو شفاعت کرنے والوں کی شفاعت کچھ نفع نہیں دے گی) اور پھر دوزخیوں کی زبان سے یہ الفاظ نقل ہوئے ہیں۔ فما لنا من شافعین ولا صدیق حمیم[4] (نہ ہمارے کوئی سفارش کرنے والے ہیں اور نہ سرگرم دوست)

بنی اسرائیل کو حضرت ابراہیم، حضرت اسحٰق اور حضرت یعقوب علیہم السلام جیسے انبیاء کی اولاد میں سے ہونے کا جو گھمنڈ تھا اور جس کی بنا پر وہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے تھے کہ ان کی نجات کے لیے ان بزرگوں کی نسبت اور سفارش ہی کافی ہوگی، یہ آیت ان کے اس واہمہ کی جڑ کاٹ رہی ہے اور ان کو اس بات کی یاد دہانی کر رہی ہے کہ خدا کے ہاں کام آنے والی اصل چیز عہدِ الٰہی کی پابندی اور ایمان و عمل صالح ہے۔ اس سے بے پروا ہو کر محض آرزوؤں کے ہوائی قلعہ پر اعتماد نہ کرو۔

۱؎ ۵۸ - نساء۔ ۲؎ ۹۵ مائدہ۔ ۳؎ ۴۸ مدثر۔ ۴؎ ۱۰۰ شعراء

وَاِذْ نَجَّیْنٰکُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ ..... بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّکُمْ عَظِیْمٌ | آلِ فرعون یعنی قوم فرعون[1] ۔ آل سے مراد صرف کسی شخص کی اولاد نہیں ہوا کرتی بلکہ یہ لفظ آل و اولاد، قوم و قبیلہ اور اتباع و انصار سب پر حاوی ہے۔

نابغہ ذبیانی کا شعر ہے:

من آل میة رائح او مغتدی   عجلان ذا زاد و غیر مزود

میہ کے قبیلہ کے لوگوں میں کوئی صبح روانہ ہوا کوئی شام، کوئی زاد راہ کے ساتھ، کوئی بغیر زاد راہ کے۔

سورہ مومن میں ہے وحاق بآل فرعون سوء العذاب (اور آل فرعون کو برے عذاب نے گھیر لیا) سورہ اعراف میں ہے ولقد اخذنا آل فرعون بالسنین ونقص من الثمرات ۱۳۰ (اور ہم نے آل فرعون کو قحط اور پھلوں کی کمی میں مبتلا کیا)۔

ان آیات میں جس عذاب کا ذکر ہے ظاہر ہے کہ وہ فرعون اور اس کی ساری قوم ہی پر آیا، نہ کہ صرف اس کی اولاد پر۔ اس کی اولاد کا تو کہیں ذکر بھی نہیں ہے۔ بلکہ جہاں تک دلائل کا تعلق ہے وہ اس کا بے اولاد ہونا ثابت کرتے ہیں۔ تورات میں یہ ذکر ضرور ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بچپن میں دریا سے جس نے نکلوایا تھا وہ فرعون کی لڑکی تھی لیکن قرآن نے اس غلطی کی بھی تصحیح کر دی ہے کہ یہ اس کی لڑکی نہیں بلکہ اس کی بیوی تھی۔ چنانچہ فرمایا ہے۔ وَقَالَتِ امْرَاَتُ فِرْعَوْنَ قُرَّتُ عَیْنٍ لِّیْ وَلَکَ لَا تَقْتُلُوْهُ عَسٰۤى اَنْ یَّنْفَعَنَاۤ اَوْ نَتَّخِذَهٗ وَلَدًا وَّهُمْ لَا یَشْعُرُوْنَ[2] (اور فرعون کی بیوی نے کہا، یہ میری اور تمہاری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے اسے قتل نہ کرو۔ ممکن ہے ہمیں نفع پہنچائے یا ہم اس کو بیٹا بنا لیں اور وہ اس بات کے انجام کا احساس نہیں رکھتے تھے)

سوم کے معنی کسی پر کوئی بوجھ یا بار ڈالنے کے ہیں، کہیں گے سامہ ظلما وسامہ خسفا اس کو ظلم کا یا ذلت کا مزہ چکھایا۔ یذبحون ابناءکم ویستحیون نساءکم (وہ تمہارے بیٹوں کو ذبح کرتے اور تمہاری عورتوں کو زندہ رکھتے) یہ اس عذاب ظلم و ذلت کی تفصیل ہے جس میں فرعونیوں کے ہاتھوں بنی اسرائیل مبتلا ہوئے۔ اگرچہ مصر میں بنی اسرائیل پر طرح طرح کے ظلم توڑے جاتے تھے اور بے شمار قسم کی ذلتوں سے انہیں سابقہ تھا جن کی تفصیل ان کی تاریخ میں موجود ہے لیکن یہاں ذکر صرف دو ہی باتوں کا بطور نمونہ فرمایا ہے۔ ان نمونوں سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ بنی اسرائیل وہاں کس شکنجہ میں تھے۔

[1] لفظ آل کی یہ تحقیق مولانا فراہیؒ کی مفردات القرآن سے ماخوذ ہے۔ [2] قصص

بیٹوں کے قتل کے اسباب اور اس کی نوعیت کی تفصیل تو کسی موزوں مقام پر آئے گی یہاں البتہ بلاغت کا ایک نکتہ ملحوظ رکھنا چاہیے۔ وہ یہ کہ لڑکوں کے ذبح کا ذکر جو کیا ہے تو (ابناء) بیٹوں کے لفظ سے کیا ہے تاکہ شفقت پدری کا جذبہ ابھرے اور لڑکیوں کے زندہ رکھنے کا ذکر کیا ہے تو ان کے لیے (نساءکم) تمہاری عورتوں کا لفظ استعمال کیا ہے اس لیے کہ غیرت کو حرکت میں لانے کے لیے یہ تعبیر زیادہ موثر تھی۔

وفی ذلکم بلاء من ربکم عظیم (اور اس میں تمہارے رب کی طرف سے بڑی آزمائش تھی) اس آزمائش کے کٹھن ہونے کی طرف یہاں اشارہ اس لیے فرمایا کہ اس نجات کی اہمیت کا انہیں کچھ اندازہ ہو سکے جو انہیں حاصل ہوئی کہ کیسا عظیم ابتلا تھا جس سے ان کے رب نے ان کو چھڑایا اگر وہ نہ چھڑاتا تو کوئی دوسری طاقت اس عذاب سے ان کو نہیں چھڑا سکتی تھی۔

واذ فرقنا بکم البحر ..... وانتم تنظرون | فرقنا بکم البحر کا ترجمہ یہ ہوگا کہ ہم نے تمہیں ساتھ لے کر دریا کو پھاڑتے ہوئے عبور کیا۔ مطلب یہ ہوگا کہ جس طرح کوئی کسی کو گود میں اٹھا کر دریا پار کرا دے اسی طرح ہم نے تمہیں پار کرایا۔

وانتم تنظرون | یعنی اپنی نجات کے بعد فرعون اور اس کے غرق ہونے کا ماجرا تم نے ساحل پر کھڑے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔

یہاں تاریخ بنی اسرائیل کے جن واقعات کی طرف اشارات کیے جا رہے ہیں ان کے متعلق دو باتیں ملحوظ رہنی چاہئیں۔

ایک یہ کہ یہ تمام واقعات بنی اسرائیل کی تاریخ کے نہایت اہم اور مشہور واقعات ہیں جن سے ان کا بچہ بچہ واقف تھا اس وجہ سے ان کی تفصیل کی ضرورت نہیں تھی، صرف اشارات کافی تھے۔

دوسری یہ کہ زمانہ نزول قرآن کے بنی اسرائیل ان واقعات کو اپنی تاریخ کے واقعات کی حیثیت سے نہ صرف مانتے تھے بلکہ ان پر فخر کرتے تھے اس بنا پر قرآن نے ان واقعات کو ان کے سامنے اس طرح پیش کیا ہے گویا یہ انہی کے ساتھ پیش آئے ہیں۔ یہ بلیغ اسلوب بیان اتمام حجت کے نقطۂ نظر سے نہایت

موثر اور مفید ہے۔

واذ واعدنا موسیٰ اربعین لیلۃ ... وانتم ظلمون | یہ اس وعدے کی طرف اشارہ ہے جو مصر سے نکلنے اور دریا پار کر چکنے کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ نے اپنے احکام و ہدایات دینے کے لیے فرمایا اور اس مقصد کے لیے ان کو طور پر بلایا۔ یہ چالیس دن کی مدت اس تعلیمی و روحانی تیاری کے لیے تھی جو کتابِ الٰہی کے بارِ عظیم کے متحمل ہونے کے لیے ضروری تھی۔ ابتداءً یہ وعدہ تیس دنوں کا تھا لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام مقررہ وقت سے پہلے پہنچ گئے۔ ان کی اس جلدی کے سبب سے اللہ تعالیٰ کی حکمتِ تربیت مقتضی ہوئی کہ یہ مدت ۳۰ دنوں سے بڑھا کر چالیس دن کردی جائے۔ مذکورہ آیت میں یہ پوری مدت جمع کردی گئی ہے۔ سورہ اعراف میں اس کی تفصیل اس طرح ہے۔ وَوٰعَدْنَا مُوْسٰى ثَلٰثِيْنَ لَيْلَةً وَّاَتْمَمْنٰهَا بِعَشْرٍ فَتَمَّ مِيْقَاتُ رَبِّهٖٓ اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً (اور ہم نے موسیٰ سے تیس راتوں کا وعدہ کیا اور اس کو پورا کیا دس راتیں بڑھا کر۔ اس طرح اس کے رب کی مقررہ مدت چالیس راتوں میں پوری ہوئی)

ثم اتخذتم العجل من بعدہ وانتم ظلمون | یعنی موسیٰؑ کے پہاڑ پر چلے جانے کے بعد تم دھات کا ایک بچھڑا بنا کر اس کی پرستش میں لگ گئے۔ کتاب خروج باب ۳۲ میں اس واقعہ کی تفصیلات موجود ہیں لیکن یہود نے اپنی عادت کے مطابق اس میں حضرت ہارون علیہ السلام کو بھی ملوث کردیا ہے جس کی قرآن نے دوسرے مقام پر تردید فرمائی ہے۔

"اور جب لوگوں نے دیکھا کہ موسیٰ نے پہاڑ سے اُترنے میں دیر لگائی تو وہ ہارون کے پاس جمع ہوکر اس سے کہنے لگے کہ اٹھ ہمارے لیے دیوتا بنا دے جو ہمارے آگے آگے چلے کیونکہ ہم نہیں جانتے کہ اس مرد موسیٰ کو جو ہم کو ملک مصر سے نکال کر لایا کیا ہوگیا ...... تب خداوند نے موسیٰ کو کہا نیچے جا کیونکہ تیرے لوگ جن کو تو ملک مصر سے نکال لایا بگڑ گئے ہیں۔ وہ اس راہ سے جس کا میں نے حکم دیا تھا بہت جلد پھر گئے ہیں۔ انھوں نے اپنے لیے ڈھالا ہوا بچھڑا بنایا اور اسے پوجا اور اس کے لیے قربانی چڑھا کر یہ بھی کہا کہ اے اسرائیل یہ تیرا وہ دیوتا ہے جو تجھ کو ملک مصر سے نکال کر لایا اور خداوند نے موسیٰ سے کہا کہ میں اس قوم کو دیکھتا ہوں کہ یہ

گردن کش قوم ہے اس لیے تو مجھے چھوڑ دے کہ میرا غضب ان پر بھڑکے اور میں ان کو بھسم کردوں (باب ۳۲ - آیات ۱-۷)

وانتم ظالمون: یعنی اس گوسالہ پرستی کا ارتکاب کرکے تم نے خود اپنی جانوں پر بہت بڑا ظلم کیا ہے۔ چنانچہ دو ہی آیتوں کے بعد قرآن نے خود اس کی وضاحت کردی ہے۔ یٰقوم انکم ظلمتم انفسکم باتخاذکم العجل (اے میری قوم کے لوگو، تم نے بچھڑے کو معبود بنا کر اپنی جانوں پر ظلم کیا) ظلم کی اصل حقیقت حق تلفی کرنا ہے۔ شرک کا ارتکاب کرکے انسان اپنے نفس کی سخت تحقیر کرتا ہے کیونکہ وہ خدا کا خلیفہ اور تمام مخلوقات سے اشرف ہونے کے باوجود اپنے ہی جیسی یا اپنے سے بھی کسی گھٹیا مخلوق کو اپنا خدا بنا بیٹھتا ہے۔ اپنے نفس کی اس سے بڑی حق تلفی اور کیا ہوسکتی ہے؟

واذ اٰتینا موسی الکتاب والفرقان | فرقان کے معنی ہیں حق و باطل کے درمیان فرق کرنے والی چیز یہاں واؤ بیان اور تفسیر کے لیے ہے۔ یعنی کتاب (تورات) ہی کو فرقان کے لفظ سے تعبیر کرکے اس کے ایک پہلو کو واضح کردیا ہے۔ قرآن مجید میں قرآن اور تورات دونوں کے لیے فرقان کی تعبیر استعمال ہوئی ہے۔ مثلاً ولقد اٰتینا موسیٰ وھارون الفرقان ۴۸ - انبیاء (اور ہم نے موسیٰ اور ہارون کو فرقان دی) اسی طرح قرآن مجید کے متعلق ہے۔ تبارک الذی نزل الفرقان علی عبدہٖ ۱- الفرقان (بڑی ہی بابرکت ہے وہ ذات جس نے اپنے بندے پر فرقان اتارا)

ان کتابوں کو فرقان کے لفظ سے تعبیر کرنے میں کئی پہلو مدنظر ہیں۔ ایک یہ کہ یہ تمام احکام و ہدایات کی تفصیل پیش کرتی ہیں۔ دوسرا یہ کہ یہ حق و باطل اور حرام و حلال کے درمیان امتیاز کرتی ہیں۔ تیسرا یہ کہ یہ اپنے مدعا و مقصد میں بالکل واضح ہیں۔ چوتھا یہ کہ ان سے انسان کو وہ حکمت حاصل ہوتی ہے جو زندگی کے تمام نشیب و فراز میں خیر و شر کی شناخت کے لیے روشنی بخشتی ہے۔

قرآن نے معرکہ بدر کو بھی فرقان کے لفظ سے تعبیر کیا ہے اس لیے کہ اس نے بھی حق و باطل کو اچھی طرح آشکارا کردیا۔

فتوبوا الی بارئکم فاقتلوا انفسکم | بارئ کا مفہوم لفظ خلق کے مفہوم سے ملتا جلتا ہے۔

قرآن مجید میں ایک ہی جگہ اللہ تعالیٰ کی تین صفتیں بیان ہوئی ہیں (ھو اللہ الخالق البارئ المصور) خلق کا مفہوم ہے کسی چیز کا خاکہ DESIGN تیار کرنا۔ برء کا مفہوم ہے اس کو ٹھیک ٹھاک کرنا، تصویر کے معنی ہیں اس کو مکمل کرنا۔ اس اعتبار سے اگرچہ خالق اور باری دونوں لفظوں کے لغوی مفہوم میں ایک باریک سا فرق ہے لیکن عام استعمال میں یہ دونوں ایک دوسرے کی جگہ پر استعمال ہوتے ہیں۔

فاقتلوا انفسکم، یعنی اپنے آپ کو قتل کرو کے معنی یہ نہیں ہیں کہ اپنی تلواریں خود اپنی گردنوں پر چلا دو بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر قبیلہ میں سے جو لوگ اس فتنۂ شرک و گوسالہ پرستی سے الگ رہے ہیں اپنے اپنے قبیلے کے ان لوگوں کی گردنیں اپنے ہاتھوں سے ماریں جنھوں نے قوم کے لیے اس فتنۂ ارتداد کی راہ کھولی ہے۔ یہ حکم دینے میں چند عظیم مصلحتیں تھیں۔

ایک یہ کہ اس طرح اس توبہ نے ایک اجتماعی توبہ کی شکل اختیار کر لی۔ گویا بنی اسرائیل کے اجتماعی ضمیر نے ان لوگوں کو اپنے اندر سے کاٹ پھینکا جنھوں نے اللہ تعالیٰ کے عہد توحید کی اہانت کی تھی۔

دوسری یہ کہ اس سے توحید کی حقیقی عظمت اور شرک کی حقیقی کراہت پورے طور پر واضح ہو گئی۔ گویا شرک ایک ایسی برائی ہے کہ اگر آدمی کا بایاں ہاتھ اس کا ارتکاب کرے تو اس کے داہنے ہاتھ کا فرض ہے کہ اپنے بائیں ہاتھ کو کاٹ کر پھینک دے۔ اس معاملہ میں نہ کسی مداہنت اور رواداری کو دخیل ہونے دے اور نہ کسی قرابت اور رشتہ داری کا لحاظ کرے۔

تیسری یہ کہ ہر قبیلہ و خاندان کے اخیار اگر اپنے اپنے قبیلوں کے اشرار پر تلوار اٹھائیں گے تو اس سے خاندانی اور قبائلی عصبیت نہیں ابھرے گی بلکہ بغیر کسی فتنہ کے اندیشہ کے بنی اسرائیل کی تطہیر ہو جائے گی۔

تورات کے مطالعہ سے بھی قریب قریب یہی بات نکلتی ہے۔ چنانچہ کتاب خروج میں ہے:۔

"جب موسیٰ نے دیکھا کہ لوگ بے قابو ہو گئے کیونکہ ہارون نے ان کو بے لگام چھوڑ کر ان کو ان کے دشمنوں کے درمیان ذلیل کر دیا[1] تو موسیٰ نے لشکر گاہ کے دروازہ پر کھڑے ہو کر کہا کہ جو خداوند کی

[1] یہود نے حضرت ہارونؑ کو بدنام کرنے کے لیے تورات میں اس قسم کے جو اضافے کیے ہیں ان کی تردید ہم مناسب موقع پر کریں گے۔

طرف ہے (یعنی عہد توحید پر قائم ہے) وہ میرے پاس آ جائے۔ تب سب بنی لاوی اس کے پاس جمع ہو گئے اور اس نے ان سے کہا کہ خداوند اسرائیل کا خدا یوں فرماتا ہے کہ تم اپنی اپنی ران سے تلوار لٹکا کر پھاٹک پھاٹک گھوم کر سارے لشکر گاہ میں اپنے اپنے بھائیوں اور اپنے اپنے ساتھیوں اور اپنے اپنے پڑوسیوں کو قتل کرتے پھرو۔ اور بنی لاوی نے موسیٰ کے کہنے کے موافق عمل کیا چنانچہ اس دن لوگوں میں سے تین ہزار مرد کھیت آئے اور موسیٰ نے کہا کہ آج خداوند کے لیے اپنے آپ کو مخصوص کرو (یعنی عہد توحید کی تجدید کرو) بلکہ ہر شخص اپنے ہی بیٹے اور اپنے ہی بھائی کے خلاف ہو تاکہ وہ تم کو آج ہی برکت دے"۔ (باب ۳۲ آیات ۲۵ - ۳۰)

اگرچہ تورات کے اس بیان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے مرتدوں کے قتل کے کام پر صرف بنی لاوی کو مامور کیا تھا لیکن خود مذکورہ اقتباس کا آخری حصہ شہادت دے رہا ہے کہ معاملہ کی اصل حقیقت وہی ہے جس کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے۔ یعنی ہر قبیلہ کے موحدین اس کام پر مامور کیے گئے کہ وہ اپنے اپنے قبیلہ کے مرتدوں کی گردنیں ماریں تاکہ یہ اہل ایمان کے مزید ایمان کی ایک شہادت ہو اور لوگ سبق حاصل کریں کہ شرک اتنا بڑا گناہ ہے کہ اس معاملہ میں باپ بیٹے کو اور بیٹا باپ کو بھی معاف کرنے والا نہیں ہے۔

تاریخ اسلام میں، یاد ہو گا، اسی قسم کا مشورہ حضرت عمرؓ نے بدر کے قیدیوں سے متعلق دیا تھا۔

اس حکم سے ایک بات تو یہ نکلتی ہے کہ توبہ کی قبولیت کے لیے اصل گناہ سے پوری پوری بیزاری ضروری ہے۔ دوسری بات یہ نکلتی ہے کہ جو برائی معاشرہ کے ذمہ داروں کی غفلت سے معاشرہ میں پھیل جائے اس کا کفارہ سب کو ادا کرنا پڑتا ہے، اس کے بغیر اللہ تعالیٰ کے ہاں یہ جرم معاف نہیں ہوتا۔ تیسری بات یہ نکلتی ہے کہ ارتداد کی سزا حضرت موسیٰؑ کی شریعت میں بھی قتل ہی تھی۔

ذلکم خیر لکم عند بارئکم یہ تمہارے پیدا کرنے والے کے نزدیک تمہارے لیے زیادہ بہتر ہے یعنی تمہیں تو بظاہر یہ ایک بہت بڑا ظلم اور بہت بڑا قومی نقصان معلوم ہو گا کہ قوم کے اتنے بڑے حصہ کو قومی جسم سے کاٹ کر پھینک دیا جائے لیکن تمہارے پیدا کرنے والے کے نزدیک اس حصہ کے کاٹ پھینکے جانے ہی میں تمہارے لیے دین و دنیا کی خیر و برکت ہے۔ اگر خاندانی جذبات اور قومی محبت کے جوش میں تم نے اس فاسد حصہ کو اپنے

وجود قومی کے ساتھ چمٹائے رکھنے ہی کو بہتر سمجھا تو یاد رکھو کہ اس کا فساد تمہارے سارے وجود قومی کو فاسد کر کے چھوڑے گا۔ اصول و عقائد سے بنی ہوئی ایک جماعت کے ساتھ اگر ان اصولوں کے مخالف بھی محض نسلی تعلق کی بنا پر چپکے رہیں تو وہ پوری جماعت تباہ ہو کے رہتی ہے۔ (میثاق)

مکتبہ میثاق کی پہلی پیشکش

مولانا امین احسن اصلاحی

کی تفسیر

تدبر قرآن

تفسیر آیت بسم اللہ و سورہ فاتحہ

اس کتاب کو خود پڑھیے اور اپنے دوستوں کو پڑھنے کیلیے دیجیے تاکہ قرآن مجید کے سمجھنے کا ذوق پیدا ہو:-

تقطیع ۲۰×۲۶/۸ صفحات ۳۶ - روپیہ ۱۲ آنے

(محصول ڈاک رجسٹری ۱۲ بک پوسٹ ۱)

مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ

کی

مندرجہ ذیل کتابیں ہمارے یہاں سے طلب فرمائیں

مفردات القرآن { قرآن کے مشکل الفاظ کی تحقیق } ایک روپیہ چار آنے (بزبان عربی)

اسباق النحو (حصہ اول) (عربی گرامر جدید طریق پر) (اردو) ایک روپیہ

اسباق النحو (حصہ دوم) (") بارہ آنے

تحفۃ الاعراب (منظوم) (عربی گرامر) (") چار آنے

امثال آصف الحکیم (عربی ادب سیکھنے کی ابتدائی کتاب) (عربی) ایک روپیہ چار آنے

کتابیں بذریعہ وی پی طلب کریں یا ان کی قیمت مع محصول ڈاک پیشگی بھیجکر طلب فرمائیں۔ محصول ڈاک [illegible]

ملنے کا پتہ: مکتبہ میثاق رحمان پورہ، اچھرہ لاہور

مطالعۂ حدیث

مولانا عبد الغفار حسن صاحب

غربت اسلام کے اسباب

گذشتہ شمارے میں حدیث نبوی بدأ الاسلام غریباً الخ کی تشریح کرتے ہوئے غربت اسلام کے مفہوم کی وضاحت کی گئی تھی۔

اس اشاعت میں غربت اسلام کے اہم اسباب کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔ اس ضمن میں غربت جدیدہ یعنی موجودہ دور میں اسلام جس غربت و اجنبیت سے دوچار ہے اس کی بھی کسی نہ کسی حد تک نشاندہی کر دی گئی ہے۔ یہ تحریر بظاہر سابقہ مضمون ہی کا تکملہ معلوم ہوتی ہے، لیکن درحقیقت اپنے مندرجات کے لحاظ سے یہ عنوان اپنی جگہ ایک مستقل حیثیت رکھتا ہے۔ اس مضمون کا اصل محرک یہ ہے کہ اسلام کے لیے فکرمند ہونے والوں کو معلوم ہو کہ ان کے اردگرد کس قسم کے افکار و خیالات کی اشاعت ہو رہی ہے اور کس طرح اسلام کی غربت کا سامان فراہم کیا جا رہا ہے۔ (ح۔ح)

قرآن حکیم میں بنی اسرائیل کے حالات تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں، ان کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ دین حق کیسے اجنبی ہو جاتا ہے اور کن اسباب و عوامل کی بنا پر اسلام کی آواز اپنے ہی نام لیواؤں کے ماحول میں نامانوس اور "غریب" بن کر رہ جاتی ہے۔

تحریف دین قرآن حکیم نے بنی اسرائیل کے جرائم کا ذکر کرتے ہوئے بتایا ہے:-

يُحَرِّفُونَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهِ وَ — کلمات کو ان کی جگہوں سے بدل ڈالتے ہیں، اور

يَقُولُونَ سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا (نساء ۴۶)

کہتے ہیں ہم نے سنا اور نافرمانی کی۔

دوسری جگہ ارشاد فرمایا :-

أَفَتَطْمَعُونَ أَن يُؤْمِنُوا لَكُمْ وَقَدْ كَانَ فَرِيقٌ مِّنْهُمْ يَسْمَعُونَ كَلَامَ اللَّهِ ثُمَّ يُحَرِّفُونَهُ مِن بَعْدِ مَا عَقَلُوهُ وَهُمْ يَعْلَمُونَ

کیا پھر تم توقع رکھتے ہو کہ وہ تمہاری بات مان لیں گے حالانکہ ان میں سے ایک گروہ اللہ کا کلام سنتا تھا پھر جانتے بوجھتے اس کو بدل ڈالتا تھا۔

یہ تحریف و ترمیم لفظی بھی ہوتی تھی اور معنوی بھی۔

غربت جدیدہ | موجودہ دور میں بھی اسلام کو اسی قسم کے حالات سے سابقہ پیش آرہا ہے۔ نہ صرف یہ کہ اسلام کی جزئیات بلکہ اسلام کی بنیادی اصطلاحات، اساسی عقائد اور قابل تعظیم دینی شعائر کی ایسی تشریح و تاویل کی جارہی ہے جس سے اسلام کا اصل چہرہ ہی مسخ ہو کر رہ جاتا ہے۔

اس فکری انتشار اور بے بنیاد تشریح و تاویل کی چند مثالیں ذیل میں درج کی جاتی ہیں :-

ایمان باللہ کا مفہوم | (۱) "دنیا کے تمام انسان اللہ پر ایمان رکھتے ہیں، فرشتوں اور دیوتاؤں کے بھی قائل ہیں اور یوم آخرت کو بھی کسی نہ کسی رنگ میں تسلیم کرتے ہیں"۔ ایک اسلام ص۲۱

"صرف قائل ہی نہیں بلکہ کسی نہ کسی طرف منہ کر کے اپنے مخصوص رنگ میں اس کی عبادت بھی کرتا ہے کوئی قبلہ رو ہو کر نماز پڑھتا ہے، کوئی شمال کی طرف منہ کر کے تورات کی تلاوت کرتا ہے، کوئی مشرق کی طرف پانی اچھالتا ہے، کوئی جلتی ہوئی آگ کے اردگرد گھومتے ہوئے اس کی حمد و ثناء کے ترانے الاپتا ہے اور کوئی پالتی مار کر اس کے تصور میں محو رہتا ہے ..... قبلہ کوئی ہو، مقصد اللہ کی عبادت ہے اور اللہ ہر طرف ہے۔" ایک اسلام ص۳۹ از برق جیلانی۔

(۲) "رسول کریم نے صرف توحید کی تعلیم دی اور اس کو معقول فطری انداز میں پیش کیا، بلکہ خاص شعائر پر ایک گروہ کی تنظیم بھی کی۔ اس میں ایک خاص قسم کا ڈسپلن بھی قائم کیا۔ اس تمام ڈسپلن کا اصل مقصد وہی ہے جو دین کے اصل مقصد یعنی توحید کے عقیدے اور اعمال صالحہ کو استوار کرنا لیکن خدا نے دیکھا کہ موحد افراد دیگر ادیان میں بھی پائے جاتے ہیں۔ جن کا

عقیدۂ توحید بھی درست ہے اور ان کے اعمال بھی صالح ہیں۔

"بعض ایسے لوگ اپنی سوسائٹی کی روایات کی وجہ سے اس مخصوص جماعت میں شامل نہ ہو سکے، جو رسول کریم نے بنا کی تھی۔ اسلام کی فراخ دلی یہ ہے کہ ایسے افراد کے متعلق اس نے نہایت درجہ رواداری برتی ہے، ان کے ایمان اور اخلاق کی تعریف کی ہے۔ ان کو اسلام میں اسی طبقہ میں داخل کیا ہے جس نے خدا کی طرف اپنا رخ کر کے زندگی بسر کی اور وہ محسن تھے"

اسلام کی بنیادی حقیقتیں ص۲۳، مضمون اساس اسلام،
شائع کردہ ادارہ ثقافت اسلامیہ[1] لاہور

ان اقتباسات کا خلاصہ یہ ہے کہ موحد بننے اور اخروی نجات و سعادت حاصل کرنے کے لیے مشرف بہ اسلام ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ انسان دوسرے ادیان و مذاہب میں رہتے ہوئے بھی اللہ تعالیٰ سے قرب اور محسن کی صفت سے متصف ہو سکتا ہے۔

اس کے برعکس واشگاف الفاظ میں قرآن کا اعلان یہ ہے :-

وَمَن يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَن يُقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي الْآخِرَةِ مِنَ الْخَاسِرِينَ (سورہ آل عمران ۹)

جو اسلام کے سوا کوئی دوسرا دین تلاش کرے گا وہ اس سے ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا، اور وہ آخرت میں گھاٹا پانے والوں میں سے ہوگا۔

ایمان بالرسول کی حیثیت | (۳) "کوئی نبی اپنے آپ کو منوانے نہیں آتا بلکہ خدا پر یقین اور اخلاق صالحہ کی تلقین کے لیے آتا ہے، اگر اس نبی کی امت اور جماعت کے باہر کچھ لوگ ایسے ملتے ہوں جن میں وہ باتیں موجود ہیں جو اصل مقصود ہیں تو ایسوں پر نجات کا دروازہ بند کرنا حد درجہ کی تنگی ہوگی"

(اسلام کی بنیادی حقیقتیں ص۲۳ مضمون اساس اسلام)

مطلب یہ ہوا کہ خالص توحید اور اعمال صالحہ کے بارے میں رہنمائی حاصل کرنے کے لیے ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی ایمان لانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ان کے بغیر بھی توحید کامل ہو سکتی ہے اور انسان جنت کا مستحق

[1] اس ادارہ کا افسوسناک پہلو یہ ہے کہ سرکاری یا نیم سرکاری ہونے کی حیثیت سے حکومت کی سرپرستی کا شرف اسے حاصل ہے۔ فالی اللہ المشتکیٰ

ہی سکتا ہے۔

ایمان بالغیب کا وسیع مفہوم (۲) "نبوت اور نبی اصطلاح اہل کتاب کی ہے اور ہم نے اس کی مختصر تاریخ بیان کرتے ہوئے واضح کر دیا ہے کہ یہ ایام جاہلیت کے ہی مناسب تھی۔ البتہ اس کو ختم کرنے والا ایک نبی ہونا چاہیے تھا ...... نبوت ایک منصب تھا، دینی حکومت تھی، اس کا خاتمہ آنحضرتؐ نے کر دیا ...... اس لیے یہ حقیقت ذہن نشین کرنی چاہیے کہ آنحضرت کے بعد اہل علم و حکمت ہی ہوں گے جو آیات قرآنیہ کی تصدیق اسی طرح کریں گے جس طرح قرآن کتب سابقہ کی آیات محکمات سے فرماتا ہے۔ اس لیے ان پر ایام جاہلیت کا نام "نبی" تو اطلاق نہیں کرے گا۔ لیکن جو کچھ اللہ تعالیٰ نے انھیں القاء یا الہام یا وحی کی ہے اس پر ایمان لانا واجب ہے اور جو نہیں لائے گا وہ یقیناً خسارے ہی رہے گا۔" (اسلام کی بنیادی حقیقتیں صفحہ ۱۹۸ مضمون اصول اسلام)

"تمام کائنات معجزہ ہے، ذرہ ذرہ معجزہ ہے اور تمام امکانات جو ذرے میں ہیں۔" "الغیب" میں جب انکشاف اہل فکر پر ہوتا ہے تو ایسی ایجادات کرتے ہیں کہ سچ مچ معجزہ ہی ہیں، اور ان کا منکر سخت کافر ہے۔"

"مذاہب اسلامیہ صفحہ ۴۴۸ شائع کردہ ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور

الکتاب کا مفہوم "قرآن ... الکتاب کی تفصیل ہے خود الکتاب نہیں ہے، الکتاب، کتاب کائنات یا صحیفہ فطرت ہے، یہی سرچشمہ وحی بھی ہے، "اتل ما اوحی الیک من الکتاب — جو کچھ تجھے الکتاب سے وحی ہوتا ہے، تلاوت کر۔" اسلام کی بنیادی حقیقتیں، صفحہ ۱۵۱

"تمام کتب مقدسہ سابقہ اور قرآن میں ریب کی گنجائش ہے۔" ......

"لیکن کتاب کائنات کا کوئی دہریہ بھی منکر نہیں۔" خلافت اسلامیہ حصہ اول صفحہ ۳

ایمان بالملائکہ کی نوعیت "جبرئیل جبرائیل لفظ سے مرکب ہے۔ "جبر" اور "ایل" سے عربی میں جبرائیل کی طرح لفظ "جبر" بھی قوت کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ "ایل" اور "اللہ" ایک ہی لفظ ہے۔ جبرئیل کے معنی قدرت اللہ۔ مذاہب اسلامیہ صفحہ ۳۸۳

یعنی ایمان بالملائکہ کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفت قدرت پر ایمان لایا جائے۔

ایمان بالآخرت کی حقیقت (الف) "یوم آخر پر ایمان ایک اصولی امر ہے لیکن قرآن بطور عقیدے کے یہ بات نہیں منواتا۔" (اسلام کی بنیادی حقیقتیں صفحہ ۱۵۰ مضمون اصول اسلام

(ب) "انسان کو اتنا تو سوچنا چاہیے کہ وہ ابتداء میں کچھ بھی نہ تھا جمادات سے ترقی کرتا ہوا انسان بنا اب تو کچھ ہے۔ بس یہ خلق جدید کا انکار محض فریب نفس ہے، لیکن عام عقیدہ کہ قیامت ایک ایسا وقت ہے جب کہ کل کائنات فنا ہو جائے گی، اللہ تعالےٰ کی صفت کاملہ، اور حکمت بالغہ کے منافی ہے۔ ہم مشاہدہ کر رہے ہیں کہ انسان مسلسل ترقی کرتا ہوا آ رہا ہے، اور یہ کہ اس کا آخر اول سے بہتر ہے وَلَلْآخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْأُولَىٰ ... ہم نے یہ کائنات کچھ بچوں کا تو کھیل نہیں کہ کھونا دل بہلانے کے لیے بنایا، اور توڑ پھوڑ کر رکھ دیا۔" (اسلام کی بنیادی حقیقتیں صفحہ ۱۵۱)

"بہر حال ذہنی ارتقاء کا مذکور قرآن میں اس طرح ہے کہ فَكَيْفَ تَتَّقُونَ إِنْ كَفَرْتُمْ يَوْمًا يَجْعَلُ الْوِلْدَانَ شِيبًا ۝ السَّمَاءُ مُنْفَطِرٌ بِهِ كَانَ وَعْدُهُ مَفْعُولًا، اب تم انکار کر رہے ہو اس دن تو تقویٰ کرتے ہی بنے گی جب طفلانِ مکتب بھی بڑے بوڑھوں کی طرح باتیں کرتے ہوں گے، جب اس ذہنی ارتقاء کے ساتھ آسمان کے پوشیدہ حالات منکشف ہوں گے۔"

مذاہب اسلامیہ صفحہ ۳۲۶ شائع کردہ "ثقافت اسلامیہ" لاہور

دعاء کا مفہوم "جو شخص اس کے قانون کو اپنی زندگی میں اپنا رہنما بنائے گا وہ قانون ہر وقت اس کا ساتھ دے گا، وہ جس وقت اس قانون کو پکارے گا وہ قانون اس کی پکار کا جواب دے گا، اجیب دعوۃ الداع اذا دعان، (قرآن) میں ہر پکارنے والے کی پکار کا جواب دیتا ہوں۔ عالمگیر قانون کا یہی خاصہ ہونا چاہیے۔" (سلیم کے نام، صفحہ ۳۶۲ شائع کردہ ادارہ طلوع اسلام")

"اس کو دعا کہتے ہیں یعنی قانون خداوندی کو اپنی رفاقت کے لیے بلانا۔" سلیم کے نام صفحہ ۳۶۳

مطلب یہ ہوا کہ خدا کو پکارنے اور دعا کرنے کے معنی یہ ہیں کہ ملت کے اجتماعی نظام یا مرکز ملت کو بلایا جائے۔

ملائکہ کا مفہوم "قرآنی معاشرے کے افراد اور قانون خداوندی کی اس رفاقت کو قرآن نے نزول ملائکہ

سے تعبیر کیا ہے۔ جنگ بدر میں ان ہی ملائکہ کے نزول کا ذکر ہے اور اسی طرح عام حالات میں بھی جہاں فرمایا اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَیْہِمُ الْمَلٰٓئِکَۃُ ملائکہ وہ قوتیں ہیں جو قانونِ خداوندی کے مطابق اعمال کو نتیجہ خیز بناتی ہیں" سلیم کے نام صفحہ ۳۰

قرآنی آیت اِذْ تَسْتَغِیْثُوْنَ رَبَّکُمْ فَاسْتَجَابَ لَکُمْ اَنِّیْ مُمِدُّکُمْ بِاَلْفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِکَۃِ مُرْدِفِیْنَ (اس وقت کو یاد کرو) جب تم اپنے رب سے فریاد کرتے تھے تو اللہ تعالیٰ نے تمہاری پکار کو سن لیا کہ وہ تمہاری مدد کرنے والا ہے۔ ایک دوسرے کے پیچھے آنے والے ایک ہزار فرشتوں سے۔ اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے لکھا گیا ہے کہ :-

"یہ فرشتے کیا کریں گے، کیا مسلمانوں سے یہ کہیں گے کہ تم جاؤ آرام سے گھروں میں بیٹھو۔ ہم ان دشمنوں کو خود ہی ختم کر ڈالیں گے؟ نہیں خدا کی نصرت اس طرح نہیں آیا کرتی۔ اس کی نصرت دلوں میں طمانیت و یقین کی بہار آفریں جنتیں بسا دیتی ہے۔۔۔۔ میدانِ جنگ میں جس چیز پر فتح و شکست کا مدار ہے وہ سپاہی کی روح ہے۔ اگر اسے اپنی کامیابی پر یقین ہے۔ اگر جمعیتِ خاطر نصیب ہے تو وہ بے تیغ بھی میدان مار سکتا ہے۔ یہی طمانیت کی دولت تھی جو اللہ تعالیٰ نے ان مجاہدین کو عطا فرمادی۔" معارف القرآن ج ۴ صفحہ ۱۹ شائع کردہ ادارہ طلوعِ اسلام

یہ طمانیتِ قلب کی دولت بھی عجیب ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی تعداد بھی بتلادی یعنی بِاَلْفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِکَۃِ (ہزار فرشتوں سے) اور یہ صفت بھی واضح کردی، مُرْدِفِیْنَ کہ وہ پے درپے ایک دوسرے کے پیچھے آنے والے ہیں۔

خلاصہ یہ ہوا کہ ملائکہ کوئی متعین مخلوق نہیں ہے بلکہ چند قوتوں کا نام ہے جن کے میدانِ جنگ میں نزول کا مطلب یہ ہے کہ سپاہی کی روح طمانیت اور یقین سے بھرپور ہو جائے۔

کَبُرَتْ کَلِمَۃً تَخْرُجُ مِنْ اَفْوَاہِہِمْ اِنْ یَّقُوْلُوْنَ اِلَّا کَذِبًا۔

نماز کے مفہوم میں تبدیلی "جس طرح ملوکیت کے استبداد میں منافقانہ زندگی خوشامد کا رنگ اختیار کرلیتی ہے۔۔۔۔ مذہب میں نماز روزہ، صدقہ خیرات ہی خوشامدانہ مسلک کے مظاہر بن جاتے

ہیں اور اس طرح انسان بزعم خویش خدا کو خوش کر لیتا ہے۔" (طلوعِ اسلام فروری ۵۵ء صفحہ ۳۴)

نظام صلوٰۃ کی تشریح "نظام صلوٰۃ کیا ہے؟ اس کے متعلق بہت کچھ لکھ چکا ہوں، لیکن قرآن نے اس تمام تفصیل کو سمٹا کر ایک فقرے میں رکھ دیا ہے۔ یعنی وَلَمْ نَکُ نُطْعِمُ الْمِسْکِیْنَ (ہم مساکین کے رزق کا انتظام نہیں کیا کرتے تھے)" (سلیم کے نام صفحہ ۲۴۵)

"لہٰذا صلوٰۃ وہ نظامِ معاشرہ ہے جس میں افرادِ معاشرہ دولت کو سمیٹ کر اپنی ذات تک محدود رکھنے (بخل) اور عقلِ فریب کار کی تحریک پر دوسروں کو دھوکا دینے اور ان سے غیروں کا سا سلوک کرنے (منکر) سے رک جاتے ہیں۔۔۔ اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْہٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ،"
سلیم کے نام صفحہ ۲۴۶

مطلب یہ ہوا کہ اقامتِ صلوٰۃ کا مفہوم مساکین کے درمیان رزق تقسیم کرنے کے ہم معنی ہے۔ نہ معلوم اقامتِ صلوٰۃ کی اس تشریح کے بعد اِذَا قُمْتُمْ اِلَی الصَّلٰوۃِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْہَکُمْ کی کیا توجیہ کی جائے گی۔

درود کی حیثیت "درود بھیجنے کا یہ طریق جو کتب روایات میں مذکور ہے رسول اللہ نے ارشاد نہیں فرمایا ہوگا۔ یہ کہیں اور سے آیا ہے۔" (طلوعِ اسلام نومبر ۵۳ء سلیم کے نام)

غالباً کہنا یہ چاہتے ہیں کہ یہ درود کی تعلیم "عجمی سازش" کا نتیجہ ہے۔ اسی لیے ارشاد ہے :-

"تیرہ سو سال سے پورا کا پورا امت کی آنکھوں پر پٹی باندھ رکھی ہے۔" (حوالہ مذکور)

ایک عجیب و غریب تعبیر "اِنَّ اللّٰہَ وَمَلٰٓئِکَتَہٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ۔ خدا کا قانون اور تدبیر امور کرنے والی قوتیں (ملائکہ) کی تائید و نصرت نبی کے شاملِ حال ہے۔ یٰٓاَیُّہَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْہِ (اے جماعتِ مومنین، تمہاری تائید و نصرت بھی اس مقصد نظامِ ربوبیت کے قیام کے حصول میں نبی اکرم یعنی مرکزِ نظامِ امت کے ساتھ ہونی چاہیے۔ وَسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا اس کی پوری اطاعت کرو، مرکز کے احکام کے سامنے گردن جھکا دو (حوالہ مذکور)

مزید چند حوالے "الصلوٰۃ صراطِ مستقیم پر چلنے کا نام ہے۔" (سلیم کے نام صفحہ ۳۹)

"اور صراطِ مستقیم متوازن راہ کو کہتے ہیں" (سلیم کے نام صفحہ ۳۹)

"اور رکوع و سجود سے مراد قانون خداوندی کی اطاعت ہے" (سلیم کے نام صفحہ ۲۰۹)

فسبح بحمد ربك العظيم کا مفہوم یہ ہے کہ اس نظام ربوبیت کے قیام کے لیے کوشاں رہو"

(سلیم کے نام صفحہ ۱۹۸)

مُصَلّی کے معنی: "مُصَلّی وہ ہے جو اس قانونِ ربوبیت کے عین پیچھے پیچھے چلتا ہے۔ کیونکہ مُصَلّی عربی میں اس گھوڑے کو کہتے ہیں جو گھوڑ دوڑ میں پہلے نمبر کے گھوڑے کے بالکل پیچھے پیچھے ہو" (سلیم کے نام صفحہ ۲۰۹)

"حَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ" کا مفہوم یہ ہے کہ دین کے پورے نظام میں اپنے افکار و اعمال کا رخ قانون خداوندی کے ساتھ متوازی رکھو" سلیم کے نام صفحہ ۲۱۳

نمازوں کی تعداد: "قرآن میں دو ہی نمازوں کا ذکر ہے، صَلٰوةُ الْفَجْرِ اور صلٰوةِ عِشَاء"

(طلوع اسلام مئی ۱۹۵۲ء مضمون از خواجہ عباد اللہ اختر)

"فرض صرف دو نمازیں ہیں جن کے اوقات بھی دو ہیں اور رکعات بھی دو"

(رسالہ مذکور اگست ۱۹۵۲ء مضمون خواجہ عباد اللہ اختر رکن

ادارہ ثقافت اسلامیہ)

"ممکن ہے کہ ان اقتباسات اور حوالہ جات کا طویل سلسلہ قارئین میثاق کے لیے بار خاطر ہو، لیکن یہ کاوش صرف اس لیے کی گئی ہے کہ اندازہ ہو سکے کہ ہمارے ملک میں کس قسم کے خیالات اور کس نوعیت کا لٹریچر پھیلایا جا رہا ہے۔ اور کس طرح مسلمانوں کو دین کی اصل بنیادوں سے منحرف کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

ایک طرف یہ فتنہ سامان سرگرمیاں اور دوسری طرف حامیانِ دینِ متین اور حاملینِ شریعتِ محمدیہ کی غفلت اور بے حسی، کیا غربتِ اسلام کا نقشہ پیش نہیں کر رہی ہے۔

(باقی آئندہ)

امام ابن تیمیہ

(از افضل العلماء مولانا محمد یوسف کوکن عمری ایم۔ اے)

امام ابن تیمیہ کے حالات اور ان کے مجددانہ کارناموں کا تفصیلی تذکرہ۔ صفحات ۶۶۲ مجلد، قیمت دس روپے صرف

ملنے کا پتہ:- المکتبۃ الرحمانیہ ۱۲۔ بی شاہ عالم مارکیٹ لاہور

مراسلہ و مذاکرہ

امین احسن اصلاحی

شوریٰ سے متعلق دو اہم سوال

سوال: کتاب و سنت کی تصریحات سے یہ امر بخوبی ثابت ہے کہ اسلام کا سیاسی نظام شورائی نوعیت کا ہے۔ اس سلسلہ میں یہ امر وضاحت طلب ہے کہ شوریٰ کی نوعیت کیا ہوگی یعنی

(۱) کیا ارکانِ شوریٰ کی تعیین ثابت ہے یا امیر جس سے چاہے مشورہ کرے۔

(۲) کیا امیر مجلس مشاورت کے ارکان کی اکثریت کے فیصلہ کا پابند ہوگا؟

امید ہے کہ جناب اولین فرصت میں ان سوالات پر روشنی ڈالیں گے۔

جواب: (۱) اسلام میں جس شوریٰ کا حکم دیا گیا ہے اس کی نوعیت یہ نہیں ہے کہ امیر جس راہ چلتے سے چاہے مشورہ کرلے بلکہ قرآن و حدیث میں اس بات کی صاف تصریح ہے کہ انہی لوگوں سے مشورہ کیا جائے جو امت کے اندر اجتہاد و استنباط کی صلاحیت رکھنے والے ہیں، جن کی حیثیت ارباب حل و عقد اور اولو الامر کی ہے اور جو علم اور تقویٰ کی صفات سے متصف ہیں۔

یہ صفتیں لفظاً بھی قرآن و حدیث میں وارد ہوئی ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین نے عملاً بھی ان صفات کو اہل شوریٰ میں ملحوظ رکھا ہے۔ چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق شوریٰ کے جتنے واقعات ملتے ہیں ان سے یہ بات بالکل واضح ہے کہ آپ قابل مشورہ امور میں انہی لوگوں کو مقدم رکھتے تھے جو علم، رائے اور لوگوں کے اعتماد کے پہلو سے فوقیت رکھنے والے ہوتے تھے۔ کوئی ایک مثال بھی ایسی نہیں ملتی ہے جس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکے کہ آپ نے اہل الرائے اور اصحاب اعتماد کو تو نظر انداز کر دیا ہو اور کسی عام آدمی سے مشورہ کر کے کسی قابل مشورہ امر کا فیصلہ کر دیا ہو۔

ٹھیک یہی طریقہ حضرات خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم اجمعین کا تھا۔ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ دونوں بزرگوں کا طریقہ یہ رہا ہے کہ جب کوئی اہم معاملہ قابلِ مشورہ سامنے آتا تو انصار و مہاجرین کے لیڈروں اور ان کے اصحابِ علم کو بلاتے اور ان سے مشورہ حاصل کرتے۔ انصار و مہاجرین اس زمانہ میں پورے سوادِ امت کی رہنمائی کرتے تھے اور مدینہ منورہ ان سب کا مرکز تھا۔ ہجرت کے حکم نے تمام مسلمانوں کو وہاں اس طرح جمع کر دیا تھا کہ مدینہ سے باہر صرف وہی لوگ ہوتے جو یا تو جنگ و جہاد کے مقصد سے نکلے ہوئے ہوتے یا حکومت کی کسی دوسری اہم خدمت کے لیے بھیجے جاتے۔ ظاہر ہے کہ ان لوگوں سے مشورہ کرنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ البتہ جو اہل الرائے مدینہ میں موجود ہوتے وہ ضرور بلائے جاتے۔ بس اتنا فرق ہوتا کہ اگر کوئی بڑی اہمیت رکھنے والا معاملہ ہوتا تو انصار و مہاجرین اور قبائل کے سارے ہی قابلِ ذکر لوگ جمع کیے جاتے ورنہ صرف خاص خاص لیڈروں سے ہی مشورہ کر لیا جاتا۔ یہ محض اس اعتماد پر کہ معاملہ ایسا سنگین نہیں ہے کہ دوسروں کو اگر نہ بلایا گیا تو اس سے ان کے اندر کوئی بے اعتمادی یا شکایت پیدا ہوگی۔

یہ ارباب حل و عقد یا اصحاب الرائے جن کو شریکِ مشورہ کیا جاتا تھا اگرچہ موجودہ سیاسی مفہوم میں قوم کے منتخب نمائندے نہیں ہوتے تھے اس لیے کہ اس زمانہ میں انتخابات کا موجودہ طریقہ روشناس نہیں ہوا تھا لیکن یہ لوگ اپنے اپنے گروہوں کے معتمد نمائندے ضرور ہوتے تھے۔ ان کے معتمد ہونے کی دلیل یہ ہوتی تھی کہ ان کے گروہوں کے لوگ اپنے معاملات میں انہی کی طرف رجوع کرتے تھے۔

اہلِ عرب جاہلیت میں چونکہ قبائلی زندگی کے عادی تھے اس وجہ سے ان کے لیے لیڈروں کے بغیر زندگی بسر کرنا ناقابلِ تصور تھا۔ اسلام کے بعد قیادت کے متعلق ان کے اقدار اور پیمانے تبدیل ہو گئے لیکن ہر گروہ نے اپنی یہ روایت باقی رکھی کہ اس کا کوئی نہ کوئی معین لیڈر ضرور ہو۔ چنانچہ جس طرح وہ جاہلیت میں اپنے معین لیڈروں کی رہنمائی اور ان کے مشوروں کی پابندی کرتے تھے اسی طرح اسلام میں بھی وہ اس روایت کے پابند رہے۔ بس فرق اگر ہوا تو یہ ہوا کہ جاہلیت میں ان کے لیڈر ابولہب اور ابوجہل کے قسم کے لوگ ہوتے تھے، اسلام میں آکر ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمر فاروقؓ کے قسم کے لوگ ہونے لگے۔

یہی لوگ تھے جن سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی عام اہمیت کے معاملات میں مشورے فرماتے تھے اور

انہی سے حضرات شیخینؓ بھی مشورے کرتے تھے۔ ان لوگوں کو کسی مشورہ میں نظر انداز نہیں کیا جاتا تھا الا آنکہ معاملہ کوئی عمومی اہمیت رکھنے والا نہ ہو۔ یا اہمیت رکھنے والا تو ہو لیکن اس کی نوعیت ایسی ہو کہ صرف مخصوص اصحابِ علم و فن ہی اس کے بارے میں کوئی مشورہ دے سکتے ہوں۔ اس وجہ سے میں یہ تو قطعی رائے رکھتا ہوں کہ حضرات شیخینؓ کے زمانہ میں اہلِ شوریٰ بالکل متعین تھے۔ البتہ یہ ضرور ہوتا رہا ہے کہ معاملات کی نوعیت کے لحاظ سے جیسا کہ عرض کیا گیا کبھی تمام نمائندے بلائے جاتے اور کبھی صرف چوٹی کے خاص خاص لوگوں ہی سے مشورہ کر لیا جاتا۔ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں تو بڑی اور چھوٹی دو الگ الگ کونسلیں موجود تھیں جن کے ارکان کے نام بھی الگ الگ مولانا شبلیؒ نے الفاروق میں گنائے ہیں اور اس باب میں جو کچھ لکھا ہے اپنی عادت کے مطابق مستند حوالوں سے لکھا ہے۔ آپ الفاروق اور حاجی معین الدین صاحب کی خلفائے راشدین میں متعلقہ ابواب پر ایک نظر ڈال لیجیے۔

۲۔ میں اس امر میں بھی بالکل یکسو ہوں کہ امیر کے لیے مجلس شوریٰ کی اکثریت کے فیصلوں کی پابندی ضروری ہے۔ اس کی اول دلیل تو وہی ہے جو صاحب احکام القرآن ابوبکر جصاصؒ نے دی ہے کہ یہ شوریٰ کی فطرت کا اقتضا ہے کہ اہلِ شوریٰ کی اکثریت کے فیصلہ کو تسلیم کیا جائے اس لیے کہ یہ بات بالکل بے معنی سی معلوم ہوتی ہے کہ اسلام میں شوریٰ کا حکم تو اس شدومد سے دیا جائے اور مقصود صرف یہ ہو کہ چند لوگوں کو شریکِ مشورہ کر کے ذرا ان کی دلداری اور عزت افزائی کر دی جائے، امیر کے لیے ان کے مشوروں کی پابندی ضروری نہ ہو۔ صاحب احکام القرآن کے نزدیک یہ شکل لوگوں کی دلداری اور عزت افزائی کی نہیں بلکہ الٹے ان کی دل شکنی اور توہین کے مرادف ہے۔

دوسری دلیل اس کی یہ ہے کہ ایک شخص کے مقابل میں ایک جماعت کی رائے بہر حال اپنے اندر صحت و اصابت کے زیادہ امکانات رکھتی ہے اس وجہ سے عقل و فطرت کا تقاضا یہی ہے کہ امیر اپنی تنہا رائے کے مقابل میں یا اپنے چند ہم خیالوں کی رائے کے مقابل میں اکثریت کی رائے کو رد نہ کرے۔ آخر ایک اجتہادی یا مصلحتی معاملہ میں اس کو یہ علم کس طرح ہوا کہ اس کی رائے صحیح اور دوسروں کی رائے غلط ہے۔ صحت اور غلطی کا امکان دونوں طرف ہے لیکن صحت کا غالب امکان اس طرف ہے جدھر اکثریت ہے۔ چنانچہ اسی بنیاد پر فرد کے مقابل میں جمہور کے

مسلک اور انفرادی اجتہاد کے بالمقابل اجماع کو شریعت میں ترجیح دی گئی ہے۔

اس کی تیسری دلیل یہ ہے کہ خلفائے راشدین کے زمانہ کی کوئی ایک مثال بھی ہمارے سامنے ایسی نہیں ہے جس سے یہ ثابت کیا جاسکے کہ انھوں نے کسی قابل مشورہ امر میں لوگوں سے مشورہ کیا ہو اور پھر ان کے متفق علیہ مشورہ یا ان کی اکثریت کی رائے کے خلاف قدم اٹھایا ہو۔ خلفائے راشدینؓ تو درکنار خود حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ آپ نے بھی جس معاملہ میں لوگوں سے مشورہ لیا اس میں اکثریت کے فیصلہ کے مطابق ہی عمل کیا۔ کوئی ایک مثال بھی اس کی خلاف ورزی کی حضورؐ سے منقول نہیں ہے۔ حالانکہ حضورؐ تو کسی معاملہ میں لوگوں کے مشورہ کے محتاج تھے اور نہ کسی مشورہ کی پابندی آپ کے لیے لازمی قرار دی جاسکتی۔

صرف حضرت ابوبکرؓ کی زندگی سے دو واقعے ایسے پیش کیے جاتے ہیں جن سے بعض حضرات یہ استدلال کرتے ہیں کہ امیر اپنی تنہا رائے کے ذریعہ سے اہل شوریٰ کے متفقہ فیصلہ یا ان کی اکثریت کی رائے کو رد (VETO) کرسکتا ہے۔ ایک حضرت ابوبکرؓ کا موقف مانعین زکوٰۃ سے جنگ کے معاملہ میں، دوسرا لشکر اسامہؓ کی روانگی کے معاملہ میں۔ لیکن میرا خیال یہ ہے کہ ان دونوں مواقع پر حضرت ابوبکرؓ نے جو موقف اختیار فرمایا اس کو عام طور پر غلط سمجھا گیا ہے اس وجہ سے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اختصار کے ساتھ میں یہاں ان کے موقف کی وضاحت کردوں۔

پہلے مانعین زکوٰۃ کے معاملہ کو لیجیے۔ حضورؐ کی وفات کے بعد عرب کے جو قبائل مرتد ہوگئے تھے ان میں ایک گروہ ان لوگوں کا بھی تھا جو کہتے تھے کہ ہم نماز تو پڑھیں گے لیکن زکوٰۃ نہیں ادا کریں گے۔ حضرت ابوبکرؓ نے ان کو بزور شمشیر ادائگی زکوٰۃ پر مجبور کرنے کا فیصلہ کیا۔ یہ معاملہ ان کے نزدیک شریعت کے ان واضح اور منصوص مسائل میں سے تھا جن کے بارے میں دو رائیں نہیں ہوسکتی تھیں، اس وجہ سے اس میں انھوں نے شوریٰ سے مشورہ حاصل کرنے کا اپنے کو پابند نہیں سمجھا بلکہ روزہ، نماز، حدود، تعزیرات اور اس قسم کے دوسرے مسائل کی طرح اس میں بحیثیت خلیفہ کے اپنی ذمہ داری خدا کے قانون کی تنفیذ سمجھی۔ چنانچہ انھوں نے اپنے اسی نقطۂ نظر کے مطابق یہ فیصلہ کیا کہ اگر یہ اسلامی بیت المال کو زکوٰۃ ادا نہ کریں تو ان کو طاقت کے زور سے اطاعت پر مجبور کیا جائے۔

جب لوگوں کو ان کے اس فیصلہ کا علم ہوا تو کچھ لوگوں نے ان سے کہا کہ ابھی اسلام کا معاملہ نیا نیا ہے،

مخالفین کی تعداد زیادہ ہے اور ہم تھوڑے ہیں۔ بیک وقت سارے عرب کا مقابلہ مشکل ہوگا اس وجہ سے بہتر ہوگا کہ اگر یہ لوگ نماز کا اقرار کرتے ہیں تو صرف زکوٰۃ کے لیے ان سے جنگ نہ کی جائے۔ بلکہ جس حد تک بھی یہ دین کے ساتھ چلنے کے لیے تیار ہیں اسی پر قناعت کرلی جائے۔ ان لوگوں نے اپنے نقطۂ نظر کی تائید میں ایک حدیث بھی پیش کی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ امرت ان اقاتل الناس حتی یقولوا لا الٰہ الا اللّٰہ فاذا قالوھا عصموا منی دماءھم واموالھم الا بحقھا وحسابھم علی اللّٰہ (مجھے یہ حکم ملا ہے کہ میں لوگوں سے جنگ کروں یہاں تک کہ وہ لا الٰہ کا اقرار کریں۔ جب وہ اس کا اقرار کرلیں گے تو ان کی جانیں اور ان کے مال میری طرف سے محفوظ ہوجائیں گے مگر اس کلمہ کے کسی حق کے تحت اور ان کے باطن کا محاسبہ اللہ کے ذمہ ہے) حضرت ابوبکرؓ نے اس کے جواب میں فرمایا کہ یہ زکوٰۃ تو اسی کلمہ کے حقوق میں شامل ہے اس وجہ سے ان لوگوں سے جنگ ناگزیر ہے۔

جب لوگوں نے حضرت ابوبکرؓ کو اپنے فیصلہ پر بالکل عازم پایا تو حضرت عمرؓ سے درخواست کی کہ وہ اس معاملہ میں حضرت ابوبکرؓ سے گفتگو کریں۔ جب حضرت عمرؓ نے گفتگو کی تو حضرت ابوبکرؓ نے ان کے سامنے اوپر والی حدیث کی وضاحت ایک دوسری حدیث کی روشنی میں کی کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا ہے کہ امرت ان اقاتل الناس علی ثلاث شھادۃ ان لا الٰہ الا اللّٰہ واقام الصلوٰۃ وایتاء الزکوٰۃ (مجھے حکم ملا ہے کہ میں تین چیزوں پر لوگوں سے جنگ کروں، کلمہ لا الٰہ الا اللہ کی شہادت پر، نماز قائم کرنے پر اور زکوٰۃ کی ادائگی پر) پس اس خدا کی قسم جس کے سوا کوئی معبود نہیں میں اس سے کم پر قناعت نہیں کروں گا۔ اگر یہ لوگ اس زکوٰۃ میں سے ایک رسی بھی روکیں گے جو رسول اللہ کو ادا کرتے رہے ہیں تو میں اس کے لیے بھی ان سے جنگ کروں گا۔ یہاں تک کہ اللہ جو بہترین فیصلہ کرنے والا ہے، میرے اور ان کے درمیان فیصلہ کردے۔ اگر میں ان لوگوں سے جنگ کرنے کے لیے کسی کو بھی نہ پاؤں گا تو ان سے تنہا جنگ کروں گا۔

ان کی اس وضاحت اور اس عزم بالجزم کے اظہار کے بعد لوگ مطمئن ہوگئے۔ بالآخر انھوں نے مانعین زکوٰۃ پر فوج کشی کی اور ان کو بیت المال کو زکوٰۃ ادا کرنے پر مجبور کردیا۔ لوگوں نے ان کے اس اقدام کو اس قدر پسند کیا کہ ابورجاء عطاردی بیان کرتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ لوگ جمع ہیں اور حضرت عمرؓ حضرت ابوبکرؓ کا سر بار بار چومتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ میں آپ پر قربان جاؤں۔ اگر آپ نہ ہوتے تو ہم تباہ ہوگئے ہوتے۔

میں نے یہ سارا بیان ابن قتیبہ کی الامامۃ والسیاسۃ سے لیا ہے اور بغیر کسی تصرف کے اس کا ترجمہ کر دیا ہے۔ اس کو پڑھنے اور اس پر غور کرنے سے چند حقیقتیں بالکل واضح طور پر سامنے آتی ہیں۔

ایک یہ کہ یہ معاملہ شوریٰ اور امیر کے درمیان کا کوئی معاملہ نہیں تھا۔ حضرت ابوبکرؓ نے اس کو شوریٰ کے سامنے پیش ہی نہیں کیا تھا۔ شوریٰ کے سامنے وہ مسائل پیش ہوتے ہیں جو اجتہاد اور امور مصلحت سے تعلق رکھنے والے ہوتے ہیں۔ یہ معاملہ دین کا ایک منصوص مسئلہ ہے۔ اسلامی حکومت میں کسی ایسی جماعت کے بحیثیت مسلم کے حقوق شہریت باقی نہیں رہتے جو بیت المال کو زکوٰۃ ادا کرنے سے انکار کر دے۔ یہ چیز اسلامی قانون میں طے شدہ ہے۔ اسی وجہ سے حضرت ابوبکرؓ کی ذمہ داری یہ نہیں تھی کہ وہ اس کو شوریٰ کے سامنے رکھتے بلکہ بحیثیت خلیفہ کے ان کی ذمہ داری صرف یہ تھی کہ وہ اس بارہ میں قانون کی تنفیذ کرتے چنانچہ انھوں نے یہی کیا۔ اس کو مثال سے یوں سمجھئے کہ اسلامی حکومت کے حدود میں کوئی جماعت اگر قتل وغارت شروع کر دے تو خلیفہ کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ اس جماعت کی سرکوبی کے لیے شوریٰ سے اجازت حاصل کرے بلکہ اس کا فرض ہے کہ قرآن نے محاربین کے لیے جو قانون بنایا ہے اس کی تنفیذ کے لیے اپنے اختیارات بے دھڑک استعمال کرے۔

دوسری یہ کہ جن لوگوں نے امیر کے اس اقدام سے متعلق تردد کا اظہار کیا ان کو ایک حدیث کے سمجھنے میں غلط فہمی ہوئی تھی۔ حضرت ابوبکرؓ نے اس حدیث کے اجمال کو ایک دوسری حدیث سے، جو انھوں نے خود حضورؐ سے سنی تھی، واضح کر دیا جس سے لوگ مطمئن ہو گئے۔ ظاہر ہے کہ اس زمانہ کے لوگوں کے نزدیک اس حدیث سے زیادہ وقیع حدیث اور کون ہو سکتی تھی جس کے راوی خود حضرت ابوبکر صدیقؓ ہوں۔

تیسری یہ کہ حضرت ابوبکرؓ نے یہ جو فرمایا کہ اگر ان لوگوں سے لڑنے کے لیے میں کسی کو نہیں پاؤں گا تو میں تنہا ان سے لڑوں گا۔ یہ شوریٰ کے کسی فیصلہ کو ٹھکرانے والی بات نہیں ہے۔ بلکہ یہ اس ذمہ داری کا صحیح صحیح اظہار و اعلان ہے جو دین کے واضح اور قطعی احکام کی تنفیذ اور ان کے اجرا سے متعلق بحیثیت خلیفہ کے ان پر عائد ہوتی تھی۔ اسلام میں خدا اور اس کے رسول کے احکام کی تنفیذ کے لیے خلیفہ کی اصل ذمہ داری یہی ہے کہ وہ ان کی تنفیذ کے لیے اپنی جان لڑا دے اگرچہ ایک شخص بھی اس کا ساتھ نہ دے۔ جمہور کے مشوروں کا پابند وہ، جیسا کہ عرض کیا گیا، مصلحتی اور اجتہادی امور میں ہے نہ کہ شریعت کی قطعیات میں۔

اسی طرح لشکر اسامہؓ کا معاملہ یہ ہے کہ اس کی ساری تیاریاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے حضور کی حیات مبارک ہی میں ہو چکی تھیں، اس کے لیے اشخاص بھی حضور کے منتخب کردہ تھے۔ اس کے لیے جھنڈا بھی خود حضورؐ نے باندھا تھا۔ یہاں تک کہ اگر حضورؐ کی علالت نے تشویش انگیز شکل نہ اختیار کر لی ہوتی تو یہ لشکر روانہ ہو چکا ہوتا۔ اسی دوران میں حضورؐ کا وصال ہو گیا اور حضورؐ کے بعد حضرت ابوبکرؓ خلیفہ ہوئے۔ انھوں نے خلیفہ ہونے کے بعد قدرتی طور پر اپنی سب سے بڑی ذمہ داری یہ سمجھی کہ حضور جس لشکر کے بھیجنے کی ساری تیاریاں اپنے سامنے کر چکے تھے اور جس کے جلد سے جلد بھیجنے کے دل سے آرزو مند تھے، اس لشکر کو اس کی پیش نظر مہم پر روانہ کریں۔ بحیثیت خلیفہ رسول کے ان کی سب سے بڑی ذمہ داری اور ان کے لیے سب سے بڑی سعادت اس وقت اگر کوئی ہو سکتی تھی تو بلا ریب یہی ہو سکتی تھی کہ وہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے منشا کو پورا کریں۔ اس کام کے لیے وہ شوریٰ سے کسی مشورہ کے محتاج نہ تھے کیونکہ اس لشکر کے بھیجنے کے فیصلہ سے متعلق سارے امور خود حضورؐ کے سامنے بلکہ حضورؐ کے حکم سے طے پا چکے تھے۔ پیغمبر کے خلیفہ کی حیثیت سے ان کا کام پیغمبر کے فیصلہ کو نافذ کرنا تھا نہ کہ اس کو بدل دینا چنانچہ کچھ لوگوں نے جب وقت کے مخصوص حالات کی بنا پر اس لشکر کی روانگی کو خلاف مصلحت قرار دیا تو انھوں نے صاف صاف کہہ دیا کہ جس جھنڈے کو رسول اللہ صلعم نے باندھا ہے میں اس کو کھولنے کے لیے تیار نہیں ہوں۔

بہرحال یہ دونوں واقعے کسی طرح بھی اس بات کی دلیل نہیں بن سکتے کہ خلیفہ کو شوریٰ کے فیصلے رد کر دینے کا حق ہے۔ یہ اگر دلیل ہیں تو اس بات کی دلیل ہیں کہ خدا اور رسول کے قطعی اور واضح احکام کی تنفیذ کے معاملہ میں خلیفہ شوریٰ سے مشورہ حاصل کرنے کا پابند نہیں ہے بلکہ اس کی ذمہ داری صرف ان احکام کی تنفیذ ہے۔

اس ساری تفصیل سے یہ بات واضح ہو گئی کہ اسلام میں شوریٰ متعین بھی ہے اور امیر اس کی اکثریت کے فیصلوں کا پابند بھی ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ اسلام کے ابتدائی دور میں چونکہ تمام اہل الرائے، جیسا کہ عرض کیا گیا، مرکز میں مجتمع رہتے تھے، جماعتوں اور قبیلوں کے لیڈر وقت کے نظام معاشرت کے تقاضے کے تحت معین ہوتے تھے، نیز مملکت کا دائرہ بہت زیادہ وسیع نہ تھا، اس وجہ سے یہ شورائی نظام بہت سادہ اور بسیط قسم کا تھا۔ اس زمانہ میں حالات بہت مختلف ہیں اس وجہ سے شوریٰ کو متعین کرنے کے لیے بعض ضروری اصلاحات کے ساتھ انتخابات کے جدید طریقوں کو اختیار کیا جا سکتا ہے اور شوریٰ اور امیر کے

باہمی تعلقات کی تعیین کے لیے ضروری قوانین بھی بنائے جاسکتے ہیں۔ ایسا کرنا اسلام کے منشا کے خلاف نہ ہوگا۔

• ضبطِ ولادت کے حق میں قرآنؑ سے استدلال؛

سوال : معلوم نہیں قرآنی نظام ربوبیت کے علمبردار رسالہ .... کی تحریریں آپ کی نظر سے گذرتی ہیں یا نہیں؟ اس نے اپنے جولائی سنہ ۶۰ء کے شمارہ میں قرآن مجید کی ایک آیت سے ضبط ولادت کے حق میں استدلال کیا ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں :—

"بچوں کو عند الضرورت پیدا کرنا ہی اس صلاحیت کا (اولاد پیدا کرنے کی صلاحیت کا) صحیح استعمال ہے۔ قرآن کریم کی اس آیت کا یہی مفہوم ہے جس میں اس نے کہا ہے کہ نساءکم حرث لکم فاتوا حرثکم انی شئتم ($\frac{۲}{۲۲۳}$) " تمہاری عورتیں تمہارے لیے کھیتی کے بمنزلہ ہیں سو تم اپنی کھیتی میں جب چاہے آؤ" کھیتی کی تشبیہ سے یہ کہنا مقصود ہے کہ وہ اولاد کی پیدائش کا ذریعہ ہیں اور جب چاہو سے مراد یہ ہے کہ جس طرح کھیت میں عند الضرورت فصل اگائی جاتی ہے اسی طرح اولاد بھی عند الضرورت پیدا کی جائے گی۔"

براہ کرم واضح فرمائیے کہ کیا قرآن مجید کی مذکورہ آیت سے ضبط ولادت کے حق میں مذکورہ استدلال صحیح ہے؟

جواب : ضبط ولادت کے مسئلہ سے تو ہمیں نفیاً یا اثباتاً کچھ زیادہ دلچسپی نہیں ہے لیکن قرآن مجید سے دلچسپی ضرور ہے۔ اس وجہ سے ہمیں مذکورہ آیت اور اس کے سیاق و سباق پر اچھی طرح غور کرنا پڑا اور اس غور و فکر کے بعد ہم جس نتیجہ پر پہنچے ہیں وہ یہ ہے کہ مذکورہ آیت سے نہ صرف یہ کہ ضبط ولادت کے حق میں کوئی دلیل نہیں نکلتی بلکہ یہ آیت مختلف پہلوؤں سے ضبط ولادت کے نظریہ کے بالکل خلاف جاتی ہے۔

جو لوگ اس آیت سے ضبط ولادت کی تائید نکال سکتے ہیں وہ قرآن سے جو چاہیں نکال سکتے ہیں، کوئی شخص بھی ایسے بے لگام لوگوں کا منہ نہیں بند کر سکتا۔

قرآن مجید نے عورتوں کو کھیتی سے تشبیہ دے کر نہایت لطیف انداز میں بہت سی باتوں کی طرف اشارہ کر دیا ہے۔ ہم ان میں سے چند اہم باتوں کی یہاں وضاحت کرتے ہیں، آپ ان سے خود نہایت بہتر طریق پر اندازہ کرلیں گے کہ یہ باتیں ضبط ولادت کے حق میں جاتی ہیں یا اس کے خلاف۔

عورتوں کو کھیتی سے تشبیہ دینے سے پہلی بات تو یہ نکلتی ہے کہ جس طرح کھیتی سے اصل مقصود پیداوار حاصل کرنا ہوتا ہے اسی طرح عورتوں کا اصل مقصود افزائش نسل انسانی ہے۔ جس طرح اس مقصد سے نکل جانے کے بعد کھیتی کھیتی نہیں رہ جاتی ہے اسی طرح مذکورہ مقصد سے نکل جانے کے بعد عورت عورت نہیں باقی رہتی۔

دوسری بات یہ نکلتی ہے کہ جس طرح ہر کسان زرخیز اور فصل آور زمین کا اپنے لیے انتخاب کرتا ہے، نہ کہ شور اور بنجر زمین کا، اسی طرح ہر مرد کو ازدواجی تعلق کے لیے ایسی عورت کا انتخاب کرنا چاہیے جو بچے جننے والی، بچوں سے محبت کرنے والی اور بچوں کی آرزو رکھنے والی ہو۔ نہ کہ بانجھ اور عقیم اور اولاد سے بیزار عورت کا، خواہ اس کا بانجھ پن مصنوعی ہو، یا حقیقی۔ اسی حقیقت کو ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح واضح فرمایا ہے کہ انکحوا الودود الولود فانی مکاثر بکم الامم یوم القیمۃ او کما قال، یعنی بچے جننے والیوں اور محبت کرنے والیوں سے شادیاں کرو کیونکہ میں قیامت کے دن تمہاری کثرت پر دوسری امتوں کے مقابل میں فخر کرنے والا ہوں۔

تیسری بات اس سے یہ نکلتی ہے کہ جس طرح ایک زیرک اور ہوشمند کسان موسم پر اپنے کھیت میں ہل چلاتا اور تخم ریزی کرتا ہے اگر وہ زمین کو بغیر تخم ریزی کے چھوڑے رکھے تو اپنی انفرادی دولت کو بھی نقصان پہنچائے، اور ملک کی اجتماعی دولت کو بھی۔ اسی طرح جو شخص عورت کی بارآوری اور اس کی آمادگی کے زمانہ کو ضائع کرتا ہے وہ اپنی شخصی ثروت کو بھی نقصان پہنچاتا ہے اور مجموعی طور پر بنی نوع انسان کو بھی نقصان پہنچاتا ہے۔

چوتھی بات اس سے یہ نکلتی ہے کہ جس طرح کوئی کسان اپنی زمین میں اس مقصد کے لیے کبھی زہر پاشی نہیں کرتا کہ اس کی زمین شور اور بنجر ہو جائے یا اس میں بوئے ہوئے تخم مارے جائیں اسی طرح کسی مرد کے لیے بھی یہ بات صحیح نہیں ہو سکتی کہ وہ عورت کو ناقابل ولادت بنا دینے کی تدبیریں کرے یا ایسی صورتیں اختیار کرے جس سے نطفہ قرار نہ پکڑ سکے یا حمل ضائع ہو جائے۔

پانچویں بات اس سے یہ نکلتی ہے کہ جس طرح کوئی کسان اپنی زمین میں محض محنت برائے محنت کے لیے ہل چلانے

کی حفاظت نہیں کرتا بلکہ چل چلاتا ہے تو پیش نظر تخم ریزی بھی ہوتی ہے اسی طرح ایک مرد کے لیے بھی یہ بات صحیح نہیں ہے کہ وہ محض اپنے بدن کا خمار نکالنے کے لیے تو عورت سے مواصلت کا خواہش مند ہو لیکن بیوی کے حاملہ ہوجانے کی ذمہ داریوں سے گھبرائے۔ چنانچہ زیر بحث آیت میں جہاں یہ فرمایا ہے کہ تم اپنی کھیتی میں جب چاہو آؤ تو وہیں یہ بات بھی فرمائی ہے کہ قدموا لانفسکم اور اپنی نسل کو آگے بڑھاؤ۔

یہ ہم نے اس تشبیہ کے صرف چند واضح پہلوؤں کی طرف اشارات کیے ہیں اور پیش نظر اختصار ہے ورنہ اس تشبیہ سے اور بھی بہت سی حقیقتیں واضح ہوتی ہیں مثلاً یہ کہ جس طرح ایک کسان اپنی کھیتی کی چرند و پرند اور آیند و روند سے حفاظت کرتا ہے اسی طرح مرد کو بھی عورت کی حفاظت و نگہداشت کرنی چاہیے، جس طرح کھیتی کے لیے موسم ہیں اور ان کا لحاظ ضروری ہے، اسی طرح عورت سے قربت کے بھی خاص زمانے ہیں اور صحت و بقائے نسل کے پہلو سے ان کا اہتمام ضروری ہے۔ نیز جس طرح کھیتی میں تخم ریزی کا اصل محل کھیت ہوتا ہے اسی طرح عورت کے معاملہ میں بھی قانون فطرت کی پابندی لازمی ہے۔ اس کی خلاف ورزی جائز نہیں ہے۔

غور کیجیے تو مذکورہ تشبیہ قرآنی سے یہ ساری باتیں نکلتی ہیں اور ان میں سے کوئی ایک بات بھی آپ ایسی نہیں بتا سکتے جو ضبط ولادت کے حق میں جاتی ہو لیکن ساون کے اندھوں کو ہمیشہ ہرا ہی ہرا نظر آتا ہے۔ جو لوگ قرآن میں ہمیشہ اپنی خواہشیں ڈھونڈتے پھرتے ہیں وہ ان گوشوں سے بھی اپنے مطلب کی بات ڈھونڈھ ہی نکالتے ہیں جہاں دور دور بھی اس کے پائے جانے کا کوئی امکان نہیں ہوتا۔

ان ذہین لوگوں سے بعید نہیں کہ اس تشبیہ کے مذکورہ نکات سننے کے بعد یہ سوال کر بیٹھیں کہ جب کھیتی کی تشبیہ سے یہ سارے مضمون نکلتے ہیں تو پھر کیوں نہ عورت کو بیع، رہن اور ہبہ کے لیے بھی مباح کر دیا جائے، کیونکہ کھیتی پر تو یہ سارے تصرفات بھی جاری ہوتے ہیں؟ ایسے نکتہ طرازوں کے جواب میں یہ گزارش ہے کہ یہ بات صحیح ہوتی اگر عورت کے حقوق، اس کی حیثیت اور اس کے درجہ و مرتبہ کو واضح کرنے والی قرآن میں صرف یہی ایک آیت ہوتی۔ لیکن قرآن اور حدیث میں عورتوں سے متعلق اور بھی احکام و ہدایات ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ عورت اگر مذکورہ بالا اعتبارات سے کھیتی سے مشابہت رکھتی ہے تو اپنے دوسرے پہلوؤں سے وہ

انسانیت کا آدھا حصہ ہے اس وجہ سے اس پر وہ قوانین بھی جاری ہوتے ہیں جو اسلام نے اس کی انسانی حیثیت کے تحفظ و تعین کے لیے بنائے ہیں۔

ہماری سمجھ میں یہ اولاد پیدا کرنے کے لیے "عند الضرورت" کی قید و شرط بھی نہیں آئی۔ آخر اس ضرورت کا فیصلہ کون کرے گا اور اس فیصلہ کے لیے معیار کیا ہوگا؟ اس کا فیصلہ تو وہی کر سکتا ہے جو اولاد پیدا کرنے پر قادر ہو۔ یہ قدرت افراد کو تو حاصل نہیں ہے کہ وہ جب چاہیں جتنی چاہیں اور جس صنف کی چاہیں اولاد پیدا کرلیں۔ کتنے افراد ہیں جو زندگی بھر اولاد کے لیے ترستے رہتے ہیں لیکن اولاد سے محروم ہی رہتے ہیں۔ کتنے ہیں جو اولاد نرینہ کے لیے ترستے مرجاتے ہیں لیکن ان کے ہاں بیٹیاں ہی بیٹیاں جنم لیتی ہیں۔ افراد کے بس میں اگر ہے تو مواصلت کرنا یا نہ کرنا ہے۔ رہا اولاد کے پیدا ہونے اور نہ ہونے کا معاملہ تو اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے۔ نہ کہ ہمارے اور آپ کے کہ اب ضرورت آپڑی ہے اس لیے اتنے بیٹے اور بیٹیاں پیدا کیجیے اور اب ضرورت باقی نہیں رہی ہے اس لیے اس سلسلہ کو بند کر دیجیے۔ اس قسم کی منصوبہ بندی تو وہی کر سکتا ہے جو پیدا کرنے پر بھی قادر ہے اور مارنے پر بھی۔ اس وجہ سے جب تک ہماری سائنس موت اور زندگی پر کنٹرول نہیں کر پاتی ہے اس وقت تک تو یہ بیل بھی منڈھے چڑھتی نظر نہیں آتی ہے۔

پھر ضرورت کے لیے آخر معیار کیا ہوگا؟ ظاہر ہے کہ ضبط ولادت کا مسئلہ روٹی کے سوال نے پیدا کیا ہے اسی وجہ سے روٹی ہی اس کے لیے معیار قرار پائے گی۔ یعنی جس کے پاس کھانے کے لیے جتنی ہی روٹی ہو اتنے ہی بچے پیدا کرے۔ لیکن ایمانداری کے ساتھ غور کیجیے کہ روٹی بھی انسان کے اپنے اختیار میں کب ہے۔ افراد ہوں یا حکومتیں روٹی پیدا کرنے کے لیے منصوبے تو بنا سکتے ہیں لیکن روٹی صرف منصوبوں سے تو نہیں پیدا ہوتی۔ اس میں تو صدہا دوسرے عوامل بھی کام کرتے ہیں جن میں سے اکثر و بیشتر ایسے ہیں جن پر ہمیں کوئی اختیار نہیں ہے بلکہ وہ تمام تر خالق کائنات کے اختیار میں ہیں۔ اس وجہ سے ہم یہ کوشش تو بے شک کر سکتے ہیں کہ اپنی پیداوار بڑھائیں لیکن یہ سوال کہ ہماری کوشش سے روٹی پیدا ہوگی کتنی۔ اس کا علم صرف اسی کو ہے جو آسمان و زمین اور ابر و ہوا کا مالک ہے۔

یہاں یہ بحث تو صرف قرآن مجید کی مذکورہ بالا تشبیہ کے تعلق سے پیدا ہوگئی ہے اور ہماری گزارش کا مقصود صرف یہ ہے کہ مذکورہ تشبیہ کسی پہلو سے بھی ضبط ولادت کے معروف نظریہ کے حق میں نہیں جاتی۔ ویسے وہ معاشی

دلائل جو اس کے حق میں دیئے جاتے ہیں تو ان پر یہاں گفتگو کا موقع نہیں ہے۔ ہم ہر مسئلہ پر پہلے اس کے اسلامی و اخلاقی پہلو سے نگاہ ڈالتے ہیں۔ کسی مسئلہ پر معاشی پہلو سے غور کرنا بھی ضروری ہے لیکن ہمارے نزدیک یہ بعد کی چیز ہے۔ ہم تو جب اس کے اخلاقی پہلو پر غور کرتے ہیں تو ہمارا دل کانپ جاتا ہے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ زنا کو روکنے والی چیزوں میں سے ایک بہت بڑی چیز حمل کا خوف ہے۔ اگر یہ خوف دلوں سے نکل جائے تو موجودہ معاشرے کی سب سے زیادہ عام وبا پھر زنا ہی کو سمجھیے۔ جس ملک کے نوجوان مرد اور نوجوان عورتیں جیبوں میں مانع حمل گولیاں لیے پھریں گے اس ملک کے اخلاقی دیوالیہ پن میں وہی شبہ کر سکتا ہے جس کی عقل میں کچھ فتور ہو۔

بقیہ اسلام کا شورائی نظام

"طلحہ اور عمرو بن معدی کرب سے جنگی کاموں میں مشورہ کرتے رہو۔"[1]

ان تصریحات کے بعد ایک دو ارشادات نبوی اور سن لیجیے جن سے اسلامی نظام شورائیت کی صحیح قدر و قیمت کا اندازہ لگانے میں مدد مل سکتی ہے۔ ایک مرتبہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

"مجھے بتایا گیا ہے کہ تین قسم کے لوگ سب سے پہلے جہنم میں جائیں گے جن میں سے ایک "امیر مسلط" ہے۔"

یعنی غالب و قاہر جو امت کی رضا کے بغیر مسندِ اقتدار پر قابض ہو جائے اور اپنی من مانی کرنے لگے:-

ایک اور موقع پر آپ نے فرمایا:-

شِرَارُ اُمَّتِيْ مَنْ يَلِي الْقَضَاءَ اِنِ اشْتُبِهَ عَلَيْهِ اُمُوْرُكُمْ لَمْ يُشَاوِرْ الخ[2]

میری امت کا بدترین شخص وہ ہے جو منصب قضا پر متمکن تو ہو لیکن مشتبہ معاملات میں مشورہ نہ کرتا ہو

(باقی آئندہ)

اطلاع: ہر قسم کی دینی اور علمی کتابیں ہم سے طلب فرمائیں۔

مکتبہ میثاق رحمان پورہ اچھرہ لاہور

[1] السنن الکبریٰ ج ۱۰ صفحہ ۱۱۳ ۔ [2] الترغیب والترہیب بحوالہ ابن حبان صفحہ ۱۰۶

اجتماعیات و سیاسیات

مولانا سید جلال الدین انصر عمری

اسلام کا شورائی نظام

(۲)

شوریٰ اور امور سیاسی | اس بحث کا تعلق ان امور سے ہے جن میں اجتہاد و استنباط کی ضرورت پڑتی ہے اور جن میں یہ اندیشہ رہتا ہے کہ کہیں ہمارا قول و عمل نصوص صحیحہ کے خلاف نہ پڑ جائے، لیکن وہ معاملات جنہیں آج کل کی اصطلاح میں خالص سیاسی معاملات کہا جاتا ہے ایک اسلامی ریاست کی ان کے سلسلہ میں کیا روش ہوگی اسے بھی احادیث اور علماءِ امت نے بالکل نکھار کر رکھ دیا ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر قول و فعل من حیث النبی ہمارے لیے حجت اور سند ہے لیکن دنیوی معاملات میں اور ان مسائل میں جن کا تعلق نبوت سے نہ ہو، آپ کا کیا مقام ہے اس کی تصریح خود آپ نے فرما دی ہے۔

عرب میں کھجور کے درختوں میں پیوند لگانے کا طریقہ عام تھا آپ نے جب اسے دیکھا تو فرمایا کہ ایسے نہ کیا جائے تو بہتر ہوگا۔ صحابہ نے ارشاد کی تعمیل میں پیوند لگانا ترک کر دیا جس کے نتیجہ میں اگلے سال فصل گھٹ گئی۔ حضور کو جب اس کا علم ہوا تو فرمایا۔

اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ اِذَا اَمَرْتُكُمْ بِشَيْءٍ مِنْ دِيْنِكُمْ فَخُذُوْا بِهٖ وَاِذَا اَمَرْتُكُمْ بِشَيْءٍ مِنْ رَأْيِيْ فَاِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ[1]

میں تو ایک آدمی ہوں، جب میں تمہیں تمہارے دین کے متعلق کوئی بات بتاؤں تو اسے لو لیکن جب میں اپنی رائے سے کوئی حکم دوں تو ایسی صورت میں میری حیثیت صرف ایک آدمی کی سی ہے۔

یہ حدیث گو ایک خاص موقع و محل میں وارد ہوئی ہے لیکن اس سے ایک اصول کلی مستنبط ہوتا ہے کہ ان

[1] صحیح مسلم باب وجوب امتثال ما قالہ شرعاً دون ما ذکرہ، مسند احمد حدیث ۱۳۹۹

تمام معاملات میں جن کا تعلق براہِ راست کتاب و سنت سے نہ ہو اور جن کی انجام دہی کا فریضہ پوری امت کے سر عائد ہوتا ہو۔ امیر یا خلیفہ کی حیثیت اس کے طے کرنے میں ایک ریاست کے ایک عام فرد کی ہو جاتی ہے۔ اسکے لیے یہ اختیار ہی نہیں ہے کہ اپنی رائے کو قانونی شکل میں امت پر ٹھونسے ، یہ بات صرف مجملاً نہیں رکھی گئی، بلکہ قرآن و حدیث کے واضح بیانات نے مسئلہ کا حقیقی رُخ متعین کر دیا ہے۔

ہماری مذکورہ بالا بحث سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ مسلمانوں کے معاملات ان کے باہمی مشورہ ہی سے آخری شکل اختیار کریں گے، اس مقام پر پہنچ کر از خود یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا امت کا ہر فرد اجتماعی معاملات میں براہِ راست دخیل ہوگا؟ ظاہر ہے کہ یہ ایک ناممکن العمل صورت ہے، اس طرح نہ کوئی معاملہ طے پا سکتا ہے اور نہ فلاح و ترقی کی راہ میں کوئی قدم اٹھایا جا سکتا ہے۔ اس لیے کہ قومی و ملی مسائل میں ہر شخص رائے دینے کا اہل نہیں ہوتا نیز زندگی کے بے شمار مسائل میں ہر فرد کی رائے حاصل کرنا ممکن بھی نہیں ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ قومی زندگی میں بعض ایسے مسائل بھی اٹھ کھڑے ہوتے ہیں جن میں ہر فرد قوم سے رائے لینی پڑتی ہے گو کہ آج دنیا جمہوریت کی دعوے دار بنتے اور نت نئے وسائل و ذرائع کی مالک ہونے کے باوجود اس مقصد میں کما حقہٗ کامیاب نہیں ہوئی ہے، بنیادی اور قوم کی قسمت کے فیصلہ کن معاملات میں بھی اگر کسی ملک کی دس فیصد آبادی حصہ لیتی ہے تو اسے بہت بڑی کامیابی تصور کیا جاتا ہے اس قسم کے معاملات میں اگر ہر شخص سے رائے حاصل کرنے کی کوشش کی جائے تو یہ اسلامی رُوح سے قریب تر ہوگی لیکن عام معاملات میں شریعت نے ایک ایسی ممکن العمل اور خالص جمہوری صورت امت کے سامنے رکھ دی ہے کہ جہاں تک افراد سعی و جہد کے باوجود آج کی متمدن دنیا کی بھی رسائی نہیں ہو سکتی ہے۔

کتاب و سنت نے اپنے ماننے والوں کو ہدایت دی ہے کہ اس قسم کے تمام معاملات میں اربابِ حل و عقد اور امت پر اثر و رسوخ رکھنے والا اور معتمد طبقہ سر جوڑ کر بیٹھے اور فلاح امت کی راہ تجویز کرے اور ساری امت اس نمائندہ گروہ کے احکام کے روبرو سرِ تسلیم خم کر دے اور عمل کے لیے کمربستہ ہو جائے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ إِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ذَٰلِكَ خَيْرٌ وَأَحْسَنُ تَأْوِيلًا ۝ (النساء ۹)

اے ایمان والو اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اور ان لوگوں کی جو تم میں سے اصحاب امر ہیں ، اگر تم کسی معاملہ میں تنازع کرنے لگو تو اسے اللہ اور رسول کی طرف لوٹا دو اگر تم اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتے ہو یہ طریقہ بہتر اور عمدہ ہے انجام کے لحاظ سے۔

اس آیت میں تین قسم کی اطاعتیں اللہ اور آخرت پر ایمان رکھنے والوں پر فرض کی گئی ہیں خدا کی اطاعت، اس کے رسول کی اطاعت اور صاحبانِ امر کی اطاعت، ساتھ ہی یہ بھی واضح کر دیا گیا کہ فیصلہ کن قوت اس گروہ کے ان مانے فیصلے نہیں ہوں گے۔ بلا قید اور بے چون و چرا اطاعت صرف خدا اور اس کے رسول کی ہوگی کتاب و سنت ہی وہ آخری معیار ہیں جن کے روبرو ہر ایک کو جبینِ نیاز خم کر دینی پڑے گی۔

اولوالامر کون ہیں "اولوالامر" سے کون سا طبقہ مراد ہے اس کی تشریح اسی سورت کے دوسرے مقام پر کر دی گئی ہے چنانچہ منافقین کے سلسلہ میں ارشاد ہوا کہ ان کی فتنہ جوئی اور بدبختی کا یہ حال ہے کہ ملک کے اندر امن و امان اور چین و سکون کی آمد ہو یا کسی خارجی خطرے اور خوف و بدامنی کا اندیشہ، یہ بدطینت اس خبر کو اس طرح نشر کرتے ہیں کہ عوام یا تو فرطِ مسرت سے بے قابو ہو جاتے ہیں اور حالات کا صحیح اندازہ نہیں کر پاتے یا پریشانی و سراسیمگی کا شکار ہو جاتے ہیں اور ان پر خوف و ہراس کے بادل منڈلانے لگتے ہیں، حالانکہ ان کے لیے صحیح روش یہ تھی کہ وہ معاملات کو اللہ کے رسول اور اس طبقہ کے حوالہ کر دیتے جنھیں مقدمات سے نتائج اخذ کرنے اور حالات کا صحیح جائزہ لینے کی صلاحیت حاصل ہے۔

وَإِذَا جَاءَهُمْ أَمْرٌ مِنَ الْأَمْنِ أَوِ الْخَوْفِ أَذَاعُوا بِهِ وَلَوْ رَدُّوهُ إِلَى الرَّسُولِ وَإِلَىٰ أُولِي الْأَمْرِ لَعَلِمَهُ الَّذِينَ يَسْتَنْبِطُونَهُ مِنْهُمْ (النساء ع ۱۱)

اور جب ان کے پاس کوئی معاملہ آتا ہے امن یا خوف کا تو اسے پھیلا دیتے ہیں اور اگر یہ اسے رسول اور صاحبانِ امر کی طرف لوٹاتے تو ان میں جو اہلِ استنباط ہیں وہ اسے سمجھتے (اور اس کے مناسب عمل اقدام کرتے)

یہاں یہ امر قابل لحاظ ہے کہ غیر معمولی اور نازک حالات میں بیک وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور "اولی الامر" کی طرف مراجعت کا حکم دیا جا رہا ہے جس سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ "اولی الامر" انتظامیہ سے متعلق طبقہ نہیں ہے بلکہ یہ وہ طبقہ ہے جو اپنی دوربین نگاہ ، اور حقیقت آشنا فہم سے معاملات کی تہ تک

پہنچ سکتا ہے جس کے اندر مسائل کے مالہ وماعلیہ سے واقف ہونے کی صلاحیت ہے اور جو امت کے لیے فلاح وبہبود کی راہ تجویز کرسکتا ہے۔

ابن خویز منداد[1] کہتے ہیں۔

"اگر کسی حاکم کو دین کے کسی مسئلہ کا صحیح علم نہ ہو یا اور کوئی پیچیدگی پیدا ہوجائے تو اس کے لیے علما کی طرف رجوع کرنا واجب ہے، اسی طرح معاملاتِ جنگ میں قائدین، دنیوی امور میں اکابر قوم اور شہروں کی آبادکاری اور ان کی صلاح وفلاح کے سلسلہ میں وزراء اور گورنروں کی طرف مراجعت ضروری ہے"[1]

شیخ محمد عبدہ[2] مصری فرماتے ہیں کہ انھوں نے ایک عرصہ تک اولوالامر کی حقیقت پر غور کیا بالآخر وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ "اولوالامر سے مراد مسلمانوں کے ارباب حل وعقد ہیں۔ اولوالامر کا دائرہ علماء، امراء، حکام، رؤساء جنود، اکابرین قوم اور تمام رہنماؤں پر وسیع ہے جن کی طرف امت اپنی ضروریات اور مصالح میں رجوع کرتی ہے۔ اگر امت کا یہ طبقہ کسی معاملہ پر متفق ہوجائے تو امت پر اس کی اطاعت واجب ہوگی بشرطیکہ "اولوالامر" مسلمانوں ہی میں سے ہوں اور ان کا حکم کتاب سنت کے خلاف نہ پڑتا ہو اور اپنی بحث اور فیصلہ میں کسی دباؤ سے مجبور نہ ہوں، ساتھ ہی ان کے اجتہاد کا دائرہ مصالحِ مومنین تک محدود ہو"[2]

چونکہ اسلامی اسٹیٹ خالص دینی اسٹیٹ ہوگی اور اس میں جس معاملہ پر بھی غور وخوض ہوگا دین ہی کے تحت ہوگا اور اس بات کی کوشش کی جائے گی کہ ہر کام کی اساس کتاب سنت کی ہدایات پر قائم ہو اسی لیے بعض ائمہ تفسیر نے "اولوالامر" کا مصداق طبقۂ علما کو قرار دیا ہے۔ اور یہ رائے اپنی جگہ پر بہت حد تک مبنی برحقیقت ہے کیونکہ اسلامی ریاست کے اربابِ بست وکشاد حالاتِ وقت کے نباض ہونے کے ساتھ ساتھ کتاب سنت میں گہری بصیرت رکھنے والے اور اس کے واقف کار ہوں گے۔

احادیث نے ان مجملات کو تفصیل کے ساتھ وضح سے واضح تر کردیا ہے۔

---

[1] تفسیر قرطبی ج ۳ ص ۲۴۹ [2] تفسیر المنار ج ۵ ص ۱۸۱۔

حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن کی اس آیت فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ (جب تم کسی بات کا فیصلہ کرلو تو خدا پر اعتماد کرو۔ اور آگے بڑھو) کا مطلب دریافت کیا گیا کہ کیا یہ "عزم" امیر اپنی صوابدید کے مطابق کرے گا یا اہل الرائے کے مشورہ کے مطابق؟ آپ نے جواب دیا "اِسْتِشَارَةُ اَهْلِ الرَّاْيِ ثُمَّ اِتِّبَاعُهُمْ" یعنی اہل الرائے سے مشورہ کیا جائے مشورہ کے بعد جیص بیص کی ضرورت نہیں بلکہ کارسازِ حقیقی پر تکیہ کیا جائے اور مشورہ کے مطابق عمل کیا جائے[1]

حضرت علیؓ ہی سے ایک دوسری روایت ہے:۔

عَنْ عَلِيٍّ قَالَ قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنْ عَرَضَ فِيْ اَمْرٌ لَمْ يُنْزَلْ فِيْهِ قَضَاءٌ فِيْ اَمْرِهٖ وَلَا سُنَّةٌ كَيْفَ تَاْمُرُنِيْ؟ قَالَ تَجْعَلُوْنَهٗ شُوْرٰى بَيْنَ اَهْلِ الْفِقْهِ وَالْعَابِدِيْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَلَا تَقْضِ بِرَاْيِكَ خَاصَّةً[2]

حضرت علیؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں میں نے آں حضرتؐ سے دریافت کیا کہ اگر میرے روبرو کوئی ایسا معاملہ پیش آجائے جس کے بارے میں نہ تو کوئی فیصلہ نازل ہوا ہو اور نہ ہی کوئی سنت ایسی صورت میں آپ مجھے کیا حکم دیتے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا تم لوگ اس معاملہ کو دین کی سمجھ رکھنے والے خدا ترس مومنوں کی شوریٰ کے حوالہ کردو اور تم اپنی تنہا رائے سے فیصلہ نہ کرو۔

پہلی روایت میں آں حضرتؐ نے صرف مثبت جواب دیا تھا کہ اہل الرائے سے مشورہ کیا جائے اور ان کے مشورہ کی پابندی کی جائے۔ دوسری روایت نے اثبات ونفی دونوں پہلوؤں کو جمع کردیا ہے یہاں آپ نے صریح الفاظ میں بتادیا کہ اسلام میں آمریت اور استبداد کے لیے سرے سے کوئی گنجائش نہیں ہے، بلکہ شریعت کا واجب الاتباع حکم یہ ہے اور جس سے کوئی ایسا نظام جو اسلامی نہج پر استوار ہو سرمو اختلاف نہیں کرسکتا کہ ان تمام مسائل کو جن کے بارے میں کتاب وسنت خاموش ہوں خدا ترس اور ارباب فہم وبصیرت کے حوالہ کیا جائے تاکہ وہ خدا کے خوف اور احساسِ ذمہ داری کے تحت معاملہ کا صحیح رخ متعین کرسکیں۔

حضرت ابوسلمہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ان مسائل کے حل کا طریقہ دریافت کیا گیا جن میں کتاب سنت کوئی واضح راہنمائی نہ دیتے ہوں۔ آپ نے جواب دیا "يَنْظُرُ فِيْهِ الْعَابِدُوْنَ

---

[1] تفسیر ابن کثیر بحوالہ ابن مردویہ ج ۱ ص ۴۲۰، [2] رواہ الطبرانی فی الاوسط

مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ ۔ عبادت گذار اور تقویٰ شعار اہل ایمان اس پر غور کریں گے[۱]۔

ایک مرتبہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنے ایک خطبہ میں فرمایا :۔

وَلْیَكُنِ الْاِبْرَامُ بَعْدَ التَّشَاوُرِ وَالصَّفْقَةُ بَعْدَ طُوْلِ التَّنَاظُرِ[۲]

قطعی فیصلہ مشورہ کے بعد ہونا چاہیے اور طویل مباحثہ کے بعد کسی بات کو آخری شکل دینا چاہیے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ قاضی شریحؒ سے فرماتے ہیں :۔

اِقْضِ بِمَا اسْتَبَانَ لَكَ مِنْ كِتَابِ اللّٰهِ فَاِنْ لَّمْ تَعْلَمْ كُلَّ كِتَابِ اللّٰهِ فَاقْضِ بِمَا اسْتَبَانَ لَكَ مِنْ قَضَاءِ رَسُوْلِ اللّٰهِ فَاِنْ لَّمْ تَعْلَمْ كُلَّ قَضَاءِ رَسُوْلِ اللّٰهِ فَاقْضِ بِمَا اسْتَبَانَ لَكَ مِنَ الْاَئِمَّةِ الْمُهْتَدِیْنَ فَاِنْ لَّمْ تَعْلَمْ كُلَّ مَا قَضَتْ بِهِ الْاَئِمَّةُ الْمُهْتَدُوْنَ فَاجْتَهِدْ رَاْیَكَ وَاسْتَشِرْ اَهْلَ الْعِلْمِ وَالصَّلَاحِ[۳]

اللہ کی کتاب سے جو تمہیں راہنمائی حاصل ہو اس کے مطابق فیصلہ کرو اگر تمہیں پوری کتاب اللہ کا علم نہیں ہے تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ معلوم ہو تو اس کے مطابق فیصلہ کرو۔ اگر رسول اللہ کے فیصلے سے بھی آگاہی نہ ہو تو ہدایت یافتہ ائمہ کے طریقے کے مطابق فیصلہ کرو اگر تمہیں ائمہ مجتہدین کے سب فیصلوں کا علم نہیں ہے تو خود اجتہاد کرو اور اہل علم اور اصحاب صلاح سے مشورہ کرو۔

اس سلسلہ میں قاضی دمشق اور حضرت عمرؓ کی ایک گفتگو نقل کرنا بھی بے حد مفید ہوگا۔

حضرت عمرؓ :۔ فیصلہ کس طرح کرتے ہو ؟

قاضی دمشق :۔ کتاب اللہ کے مطابق

حضرت عمرؓ :۔ اگر کسی مسئلہ کا حل کتاب اللہ میں نہ ملے تو کیا کرتے ہو ؟

قاضی دمشق :۔ سنت رسول اللہ کی روشنی میں فیصلہ کرتا ہوں۔

حضرت عمرؓ :۔ اگر نبی کی سنت میں بھی راہنمائی نہ ملے تو پھر کیا صورت اختیار کرتے ہو ؟

قاضی دمشق :۔ اجتہاد کرتا ہوں اور اپنے ہم نشینوں سے مشورہ کرتا ہوں۔

[۱] سنن دارمی باب التورع عن الجواب فی ما لیس فی کتاب ولا سنة صفحہ ۴۸۔ [۲] عیون الاخبار ج ۲ صفحہ ۲۴۳۔
[۳] کنز العمال ج ۳ صفحہ ۱۲۷

حضرت عمرؓ :۔ بہت خوب[۱]

مسلم بن مخلدؒ نے حضرت زید بن ثابتؓ سے کہا کہ مجھے محکمۂ قضا کے لیے مجبور کیا گیا ہے، بتایئے کن بنیادوں پر فیصلہ کیا جائے۔ حضرت زید بن ثابتؓ نے جواب دیا "کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ کرو، اگر کتاب اللہ میں حل نہ ملے تو سنت کی طرف رجوع کرو، اگر سنت میں بھی کوئی جواب نہ ملے تو اہل الرای حضرات کو بلاؤ اور ان سے مشورہ کرکے فیصلہ دو[۲]۔"

مشہور تابعی عروہؒ نے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ سے دریافت کیا کہ فیصلہ کیسے کیا جائے۔ جواب دیا:

اِنَّ رَاْسَ الْقَضَاءِ اتِّبَاعُ مَا فِیْ كِتَابِ اللّٰهِ ثُمَّ الْقَضَاءُ بِسُنَّةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ثُمَّ بِحُكْمِ اَئِمَّةِ الْهُدٰى ثُمَّ اسْتِشَارَةُ ذَوِی الْعِلْمِ وَالرَّاْیِ[۳]

قضاء کا بہترین طریقہ کتاب اللہ کی اتباع ہے پھر سنت رسول کے مطابق فیصلہ کرنا پھر ائمہ ہدیٰ کے نظائر کے مطابق کرنا ہے۔ اگر یہاں بھی مسئلہ حل نہ ہو تو اصحاب علم و رای سے مشورہ کے بعد فیصلہ کرنا چاہیے۔

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے تمام علاقوں میں یہ حکم نافذ کردیا تھا کہ ہر مقام کے لوگوں کو وہاں کے فقہاء کی متفقہ رائے کے مطابق فیصلہ کرنا ضروری ہے[۴]۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ عمرو بن العاصؓ کے نام ایک فرمان میں لکھتے ہیں :۔

["میں نے خالد بن ولیدؓ کو لکھ بھیجا ہے کہ وہ تمہاری اعانت کے لیے پہنچ جائیں، جب وہ تمہارے پاس آجائیں تو ان کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آؤ اور اپنی رفعت شان اور تفوق کا مظاہرہ نہ کرو، خالد بن ولید اور دیگر اصحاب پر تمہیں امیر مقرر کردینے کی وجہ سے ان کے مشورہ کے بغیر کوئی فیصلہ نہ کرو اور کسی معاملہ میں ان کی مخالفت نہ کرو[۵]"]

ایک اور خط میں عمرو بن العاصؓ ہی کو لکھتے ہیں :۔

"جنگی معاملات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہم سے مشورہ کیا کرتے تھے تم بھی اس طریقہ کی پابندی کرو[۶]۔"

حضرت عمر رضی اللہ عنہ سعد بن ابی وقاصؓ کو لکھتے ہیں :۔ (باقی صفحہ ۴۲ پر)

[۱] کنز العمال ج ۳ صفحہ ۱۷۴، [۲] السنن الکبریٰ ج ۱۰ صفحہ ۱۱۵، [۳] مختصر جامع بیان العلم وفضلہ صفحہ ۱۶۸۔
[۴] دارمی صفحہ ۴۸ باب اختلاف الفقہاء [۵] کنز العمال ج ۳ صفحہ ۱۳۳۔ [۶] کنز العمال ج ۲ صفحہ ۱۶۳

مقالات

مولانا ضیاء الدین صاحب اصلاحی

خانہ کعبہ کی اہمیت کے اسباب

(بسلسلہ ماہ اگست ۱۹۶۰ء) :-

ان آیتوں میں صرف خانہ کعبہ کے مرکز و قبلہ ہونے ہی کا ذکر نہیں ہے بلکہ یہود کے دو گروہوں شریر و مفسدین (اوتوا الکتاب) اور صلحاء و اخیار (آتیناھم الکتاب) کا اس اعتبار سے تذکرہ ہے کہ وہ دونوں ہی قرآن کی جملہ باتوں کی حقانیت اور صداقت کے متعلق اچھی طرح جانتے ہیں یَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ اور یَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ اور اس طرح کے دوسرے فقروں میں ضمیر "ہ" کا مرجع بعض مفسرین نے توجہ قبلہ کو قرار دیا ہے لیکن ہمارے نزدیک اس میں وسعت اور عموم ہے اس لیے ضمیروں کا مرجع قرآن حکیم ہے اور مفہوم یہ ہوگا کہ یہود قرآن کے برحق اور منزل من اللہ ہونے کی حقیقت سے اچھی طرح آگاہ تھے اور موقع و محل کے اعتبار سے یہ خاص صورت بھی اس میں شامل ہوگی کہ قبلہ کے متعلق قرآن جو تصریحات بیان کر رہا ہے وہ سب نہایت صحیح اور درست ہیں اور اس صحت و صداقت کو شریر و بدبخت اور صالح و نیکوکار دونوں قسم کے یہود جانتے اور سمجھتے ہیں۔ اب اسی سلسلہ میں یہ آیت بھی پڑھیے :-

سَيَقُوْلُ السُّفَهَآءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلّٰىهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِيْ كَانُوْا عَلَيْهَا قُلْ لِّلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (بقرہ ۱۴۲)

بیوقوف لوگ کہیں گے کہ کس چیز نے انھیں (مسلمانوں کو) ان کے اس قبلہ سے جس پر وہ تھے پھیر دیا۔ تم کہہ دو کہ مشرق و مغرب تو اللہ ہی کا ہے وہ جسے چاہے سیدھے راستہ کی ہدایت دے۔

یہاں سفہاء کا لفظ بڑا معنی خیز ہے اس سے پہلے گذر چکا ہے کہ "وَمَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهٖمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ" یعنی یہ بیوقوف لوگ وہی ہیں جو ملت ابراہیمی سے بیزار اور متنفر ہیں اس لیے ان کے اعتراض و اشکال کی کوئی حیثیت نہیں اور يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ کہہ کر دو باتوں کی طرف نہایت لطیف اشارہ کرنا مقصود ہے۔ پہلی بات یہ ہے کہ یہود و نصاریٰ دین صحیح پر قائم نہیں رہے اور یہ خدا ہی کا کام ہے کہ جسے چاہے دین مستقیم کی توفیق عطا کرے۔ دوسری بات یہ ہے کہ مسلمانوں کا قبلہ ہی صحیح، وسط اور ملت ابراہیم کے عین مطابق ہے، یہود و نصاریٰ نے غلط اور باطل مرکز بنا لیے ہیں۔

یہاں جن آیات کی روشنی میں ہم نے اصولی بحث کی ہے ان میں نہایت تصریح اور وضاحت کے ساتھ بیت اللہ کو قبلہ بنانے کی ہدایت اور تلقین کی گئی ہے اور ساتھ ہی یہ بھی بتایا گیا ہے کہ یہی دین ابراہیمی کا قبلہ تھا اور اسی کو یہود و نصاریٰ بھی اصل قبلہ سمجھتے تھے مگر اپنی طبعی شرارت اور عداوت سے مجبور ہو کر کتمان حق کے مرتکب بن رہے تھے (وان فریقا منهم لیکتمون الحق وهم یعلمون) اب اور آگے بڑھ کر ان آیات کو پڑھیے جن سے خانۂ کعبہ کی مرکزیت اور اس کے تمام ذریت ابراہیمی کے قبلہ ہونے کا مزید ثبوت ملتا ہے :-

وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَاَمْنًا وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى (بقرہ ۱۲۵)

اور یاد کرو جب ہم نے بیت اللہ کو لوگوں کا مرجع و مرکز (یعنی رخ کرنے کی جگہ) اور جائے امن بنایا اور یہ حکم دیا کہ ابراہیم کے مسکن کو عبادت گاہ بناؤ۔

سورۂ آل عمران میں فرمایا :-

اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِيْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّهُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ فِيْهِ اٰيٰتٌ بَيِّنٰتٌ مَّقَامُ اِبْرٰهِيْمَ وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ۔ (آل عمران ۹۶، ۹۷)

بیشک پہلا گھر جو لوگوں کے لیے (عبادت الٰہی کا مرکز) بنایا گیا وہ بکہ میں بابرکت اور دنیا والوں کے لیے موجب ہدایت ہے اس میں واضح نشانیاں ہیں۔ ابراہیم کے کھڑے ہونے کی جگہ، اور جو اس میں داخل ہو وہ مامون ہوگا۔ اللہ کے لیے لوگوں پر اس گھر کا حج کرنا فرض ہے جو وہاں پہنچنے کی طاقت رکھے اور جس نے انکار کیا تو اللہ دنیا والوں سے بے نیاز ہے۔

اس آیت میں کئی باتیں صاف طور سے نمایاں ہیں۔ مثلاً بیت اللہ عبادت الٰہی کا اولین مرکز ہے۔ یہاں بعض واضح نشانیاں مثلاً ابراہیم کے قیام کی جگہ اور ان کی دعا کے مطابق پرامن سرزمین ہے اسی لیے اس کو قبلہ ہونا چاہیے اور تمام لوگوں پر اس کی زیارت کرنا فرض ہے اس لیے کہ وہ دین ابراہیمی کی اصل و اساس اور اس کا قبلہ ہے۔ اور جو لوگ اس گھر کی ان حیثیتوں کو نظرانداز کرکے اس کے حج و زیارت کا اہتمام نہیں کرتے وہ لوگ کفر و انکار میں مبتلا ہیں اور خدا تعالیٰ ان سے بے نیاز اور بے پروا ہے۔ اسی مفہوم سے ملتی جلتی یہ آیت بھی ہے۔

وَاِذْ بَوَّاْنَا لِاِبْرٰهِيْمَ مَكَانَ الْبَيْتِ اَنْ لَّا تُشْرِكْ بِيْ شَيْـًٔا وَّطَهِّرْ بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْقَآئِمِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ وَاَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَاْتُوْكَ رِجَالًا وَّعَلٰى كُلِّ ضَامِرٍ يَّاْتِيْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيْقٍ

(حج ۲۶ - ۲۷)

اور یاد کرو جب ہم نے ابراہیم کو خانہ کعبہ کے پاس بسایا اور حکم دیا کہ وہ کسی کو میرا ساجھی نہ بنائے اور میرے گھر کو طواف کرنے (والوں) جھکنے (رکوع) اور سجدہ کرنے والوں کے لیے پاک صاف رکھے اور لوگوں میں اس کے حج و زیارت کا اعلان کرے تاکہ وہ پیدل اور لاغر اونٹنیوں پر گہرے راستوں سے آئیں۔

ایک اور آیت میں ہے :-

رَبَّنَآ اِنِّىْٓ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ بِوَادٍ غَيْرِ ذِيْ زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ فَاجْعَلْ اَفْـِٕدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِيْٓ اِلَيْهِمْ (ابراہیم ۳۷)

اے میرے پروردگار میں نے اپنی بعض اولاد کو ایک بن کھیتی کی زمین میں تیرے محترم گھر کے پاس بسایا ہے۔ اے میرے پروردگار تاکہ یہ نماز قائم کریں، پس تو لوگوں کے دل ان کی طرف مائل کردے۔

ان تمام آیتوں سے بیت اللہ کی ہمہ گیری اور مرکزیت صاف ظاہر ہے اور اس کے حج و زیارت، اس کی طرف رخ کرکے نماز اور عبادت کرنے کا حکم بھی اسی لیے دیا گیا ہے کہ وہ قبلہ ہے۔

لیکن اب تک بیت اللہ کی مرکزیت اور قبلہ ہونے کے متعلق تمام تر قرآنی تصریحات بیان کی گئی ہیں اب تورات کی شہادت بھی ملاحظہ ہو۔ استاذ امام مولانا حمید الدین فراہیؒ نے الرای الصحیح فیمن ھو الذبیح میں اسی موضوع پر ایک فصل تحریر فرمائی ہے، اسے نقل کردینا مفید ہوگا۔ وہ فرماتے ہیں :-

"ہمارے مذکورہ دعاوی کی مزید تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت اسماعیلؑ کے مسکن کو تمام ذریت ابراہیمؑ کا قبلہ قرار دیا۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی اولاد کو عرب کے مشرق اور شمال میں آباد کیا اور ان کا قبلہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کے مسکن کو قرار دیا چنانچہ تورات سے ثابت ہے کہ ان کو ان کے تمام بھائیوں کے آگے بسایا۔ پیدائش ۲۵ - ۱۸ میں ہے :-

"اور اس کی اولاد حویلہ سے شور تک جو مصر کے سامنے اس راستہ پر ہے جس سے اسور کو جاتے ہیں آباد تھی یہ لوگ اپنے سب بھائیوں کے سامنے بسے ہوئے تھے۔"

اور پیدائش ۱۶ : ۱۲ میں ہے :-

"وہ گورخر کی طرح آزاد مرد ہوگا، اس کا ہاتھ سب کے خلاف اور سب کے ہاتھ اس کے خلاف ہوں گے اور وہ اپنے سب بھائیوں کے سامنے بسا رہے گا۔"

"سب بھائیوں کے سامنے بسنے" کی جو تاویل ہم نے کی ہے اس کے سوا اس کی کوئی دوسری صحیح تاویل ممکن نہیں کیونکہ معلوم ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کی تمام اولاد ماسوائے اسماعیل کے مشرق و شمال میں آباد ہوئی بس حضرت اسماعیلؑ ان سب کے سامنے اسی وقت ہوسکتے ہیں جب یہ مانا جائے کہ ان کی بستی ان سب کے قبلہ کے سمت میں تھی، اور اس کو مان لینا بہت اقرب ہے، کیونکہ حضرت ابراہیمؑ کو اللہ تعالیٰ نے سب کا امام بنایا تھا اور ان کے بعد اس امامت کے وارث حضرت اسماعیلؑ ہوئے۔ قرآن مجید نے بھی اس معاملہ کی طرف بعض اشارات کیے ہیں :-

وَاِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ قَالَ اِنِّىْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا قَالَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِىْ قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِي الظّٰلِمِيْنَ وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَاَمْنًا وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى (بقرہ ۱۲۴ و ۱۲۵)

اور یاد کرو جب ابراہیمؑ کو اس کے رب نے چند باتوں میں آزمایا اور ابراہیمؑ نے انھیں پورا کردیا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں تم کو لوگوں کا امام بناؤں گا اور پوچھا میری اولاد میں سے، اللہ نے کہا میرا عہد ظالموں سے نہیں اور جب ہم نے بیت اللہ کو لوگوں کا مرکز اور امن کی جگہ بنایا اور حکم دیا کہ جائے مسکن ابراہیمؑ کو نماز کی جگہ۔

اس تفصیل سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت اسماعیلؑ کے مسکن کو تمام ذریت ابراہیمؑ کی قربانیوں کا قبلہ قرار دینے کی وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کی عظیم الشان قربان گاہ وہیں تھی۔

ان تمام باتوں سے قطع نظر مجرد اس بات پر غور کرو کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بیت المقدس کے بجائے خانہ کعبہ کی تعمیر کی تھی اور یہیں اپنے لخت جگر کو قربان کرنا چاہتے تھے اور یہی گھر ان کی دعاؤں اور آرزوؤں کا مرکز تھا تو پھر اس کے قبلہ نہ ہونے کی کوئی وجہ ہی نہیں ہو سکتی اور یقین ہے کہ جو لوگ ان باتوں کو سامنے رکھ کر غور کریں گے وہ اصل حقیقت سے بے خبر نہیں رہ سکتے اور خانہ کعبہ کے بجائے کسی اور مقام اور گھر کو عبادت و قربانی کا مرکز و قبلہ قرار دینے کو نہایت عجیب غریب اور مضحکہ خیز بات سمجھیں گے۔

۶- خانۂ کعبہ کی عظمت و بلندی کا ایک سبب یہ ہے کہ واقعہ قربانی یہاں پیش آیا اگرچہ قرآن مجید میں اس کی تصریح موجود نہیں ہے لیکن توراۃ سے اس کی نہایت واضح شہادت ملتی ہے اور اسی لیے یہود کو بھی قربانیوں کا قبلہ مکہ معظمہ میں بنانے کی تاکید کی گئی تھی مگر وہ تحریف، تلبیس اور کتمان حق کی تمام ناپاکیوں اور مذموم عادتوں میں ملوث تھے۔ اس لیے انھوں نے اس بات پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی۔ استاذ امامؒ نے اس پر نہایت مفصل اور تحقیق کے ساتھ بحث کی ہے یہاں اس کا خلاصہ بیان کیا جاتا ہے:-

"توراۃ میں واقعہ ذبح کے ذکر میں ہے "تیسرے دن ابراہیمؑ نے نگاہ اٹھائی اور قربانی کی جگہ کو دور سے دیکھا"۔ یہود کہتے ہیں کہ قربان گاہ یروشلم میں ہیکل سلیمان کے پاس ہے اور نصاریٰ کا دعویٰ ہے کہ یہ وہ مقام ہے جہاں حضرت مسیحؑ کو سولی دی گئی تھی۔ لیکن محققین علماء توریت نے خود اس کی تردید کی ہے، توراۃ میں قربان گاہ کے لیے مورہ، موریہ اور مریا وغیرہ الفاظ آئے ہیں جو سب دراصل مروہ کی بگڑی ہوئی شکلیں ہیں کیونکہ ان کی جو خصوصیات بیان ہوئی ہیں وہ کسی طرح یہود و نصاریٰ کے دعوے پر منطبق نہیں ہوتیں اس لیے ماننا پڑے گا کہ یہ وہی مقام ہے جو بنی اسماعیل کے مسکن میں مروہ کے نام سے مشہور ہے جیسا کہ قضاۃ (۷: ۱) میں ہے:-

"اور مدیانیوں کی لشکر گاہ ان کے شمال کی طرف کوہ مورہ کے متصل وادی میں تھی"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مورہ کی پہاڑی مدیانیوں کی لشکر گاہ تھی اور مدیان سے قطعی طور پر بنی اسماعیل

مراد ہیں، اس لیے مورہ مدیان کے مسکن میں ہے نہ کہ شام میں، کیونکہ اس قسم کے نام کی وہاں کوئی جگہ ہی نہ تھی۔ اس امر کا خود علماء توراۃ کو بھی اعتراف ہے اس لیے اسے مروہ کی بگڑی اور تحریف شدہ شکل ماننے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں۔

اس معاملہ پر ایک اور پہلو سے غور کرنے کی ضرورت ہے کیونکہ یہ تو سب جانتے ہیں کہ حضرت ابراہیمؑ نے اپنی قربانی کی جانے والی اولاد (اسماعیل) کو وادی غیر ذی زرع میں بسایا تھا اور وہیں بیت اللہ کی تعمیر کی تھی، اس سے صاف ظاہر ہے کہ اسی سرزمین میں قربانی کا واقعہ بھی پیش آیا تھا۔ قرآن مجید کی اس آیت پر اسی حیثیت سے غور کرنا چاہیے:-

وَاِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ ...... وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَاَمْنًا وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى (بقرہ ۱۲۴، ۱۲۵)

اور یاد کرو جب ابراہیمؑ کو اس کے رب نے چند باتوں میں آزمایا اور اس نے انھیں پورا کر دیا ...... اور ہم نے بیت اللہ کو مرکز و مرجع اور امن کی جگہ بنایا اور تاکید کی کہ ابراہیمؑ کے کھڑے ہونے کی جگہ کو لوگ نماز کی جگہ بناؤ

یہاں حضرت ابراہیمؑ کی سب سے بڑی اور عظیم ابتلاء یعنی قربانی کا ذکر ہے، آیت قربانی میں بھی اسے ابتلاء و آزمائش ہی کہا گیا ہے:-

اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْبَلٰۗؤُا الْمُبِيْنُ (صافات ۱۰۶) بے شک یہ کھلی ہوئی آزمائش ہے۔

اور اسی آزمائش میں پورا اتر جانے کے بعد اللہ تعالیٰ نے انھیں امامت و خلافت کے منصب جلیل پر فائز کیا اور ان کے بنائے ہوئے مقدس گھر کو مرکزیت و جامعیت عطا فرمائی۔ اسی لیے ابتلاء کے بعد اسی کا (مرکزیت و امامت کا) ذکر کیا گیا ہے۔ اور یہ اس بات کا صریح ثبوت ہے کہ قربانی کا عظیم الشان واقعہ کعبہ کے اردگرد ہی میں پیش آیا تھا۔

ممکن ہے ہمارے استنباط کو نکتہ آفرینی پر محمول کیا جائے اس لیے توراۃ سے بھی اس کی تصدیق و تائید پیش کر دینا مناسب ہوگا۔ کتاب پیدائش (۲۱: ۱۴) میں ہے:-

"تب ابراہام نے صبح سویرے اٹھ کر روٹی اور پانی کی ایک مشک لی اور اسے ہاجرہ کو دیا

بلکہ اسے اس کے کندھے پر دھر دیا اور لڑکے کو بھی اس کے حوالہ کر کے رخصت کر دیا سو وہ چلی گئی اور بیرسبع کے بیابان میں آوارہ پھرنے لگی ... اور خدا اس لڑکے کے ساتھ تھا اور وہ بڑا ہوا اور بیابان میں رہنے لگا۔"

اس عبارت میں بیابان اور بیرسبع کا بیابان کے الفاظ آئے ہیں اس لیے کہ وہ کوئی آباد و شاداب مقام نہ تھا، حضرت ابراہیمؑ نے وہاں سات کنویں کھودے تھے اس وجہ سے ابتداء میں اس کو بیرسبع کا بیابان کہتے تھے اور اس سے یہ نتیجہ بھی نکلتا ہے کہ حضرت اسمٰعیل اور ان کی ماں اور خود حضرت ابراہیمؑ کا بھی مسکن بیرسبع کا بیابان ہی تھا اور وہ یہیں سے قربانی کے لیے نکلے اور پھر واپس بھی یہیں آئے تھے اور توراۃ کی تصریحات پہلے ہم بیان کر چکے ہیں کہ قربانی کا مقام مورہ ہے اس لیے لامحالہ یہ ماننا پڑے گا کہ وہ اسی سرزمین میں مسکن اسماعیل کے پاس ہے نہ کہ شام میں حضرت اسحاقؑ اور ان کی ماں حضرت سارہؑ کے مسکن کے پاس۔ اسی لیے کہ وہاں تو حضرت ابراہیمؑ اسی وقت بیرسبع کے بیابان سے جاتے ہیں جب انھیں حضرت سارہ کی وفات کی خبر معلوم ہوتی ہے۔ پیدائش ۲۳ - ۲ میں ہے :-

" اور سارہ نے قریہ اربع میں وفات پائی یہ کنعان میں ہے اور حبرون بھی کہلاتا ہے، اور ابراہام سارہ کے لیے ماتم اور نوحہ کرنے وہاں گیا۔"

ہمارے خیال میں قرآن مجید اور صحیح احادیث سے بھی ان باتوں کی تائید اور توثیق ہوتی ہے۔ صفا و مروہ کے طواف کا حکم اور شعائر الٰہی میں اس کے داخل ہونے کی وجہ بھی یہی ہے کہ مروہ ہی وہ مقام ہے جہاں دین الٰہی اور ملت حنیفی کا ایک مہتم بالشان واقعہ پیش آیا تھا مگر یہود کی پر فریب اور شرارت پسند طبیعت نے اس بات کو پردۂ اخفا میں ڈال دیا اور غالباً اسی لیے قرآن پاک نے مروہ کے شعائر الٰہی میں ہونے اور یہود کے اس کتمان کے متعلق اس آیت میں تذکرہ کیا ہے

(باقی آئندہ)

محی الدین پرنٹر پبلشر نے اشرف پریس لاہور میں چھپوا کر دفتر میثاق ۱۱ - احمد سٹریٹ رحمان پورہ اچھرہ لاہور سے شائع کیا